



قابيل افغان

محمد طاهر راق

فَادِلِي فَسَار

مُحَمَّدٌ طَاهِرٌ رَّازِقُ



علیٰ مجاسِ تفظیت پُبِوہ

حضوری باغ روڈ ملتان 40978

آنینہ مظاہیں

| | | |
|-----|--|--|
| 5 | اتساب | |
| 6 | قصہ درد (محمد طاہر رضاق) | |
| 11 | انسانہ ہائے قادریانیت کی حقیقت (نیم صدیق) | |
| 18 | اپنی ذات میں اُبھمن (ساججزادہ سید خورشید احمد گلابی) | |
| 21 | محمد طاہر رضاق -- نئے محمد کا انسانہ نگار (شیخ مرزا) | |
| 26 | نقاب کشا (امتحان احمد) | |
| 27 | اپنی بات (نیاش اختر لک) | |
| 29 | جال | |
| 39 | اور پھر رکھو آجیا | |
| 47 | 5۔ ہزار | |
| 55 | تفسیر عثمانی | |
| 61 | چنم سے فرار | |
| 71 | مردوں کیس کا | |
| 81 | وفا | |
| 91 | جموٹا | |
| 99 | اور پھری مکمل ہو گئی | |
| 107 | تیری تصویر دیکھ کر | |
| 117 | ایسا بھی ہوتا ہے | |
| 125 | نوجہ | |

قادیان افسانے

محمد طاہر زراق



چھنستا نہ دے

دو مہلکت پھولوں

علیٰ طاہر اور محمد عثمان

کنام

رنگ، خوبلو، صبا، چاند، تارے کران، پھول، شبنم، آبجو، چاندنی
آن کے حسن کی تکمیل ہیں حسن فطرت کی ہر چیز کام ہا آگئی

قصہ درد

تاریخ عالم اخاکر دیکھئے۔ کفر نے اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے ہیشہ ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ وہ کون ساجال ہے، جو اسلام کو مقید کرنے کے لئے استعمل نہ کیا گیا۔ وہ کون سی خطرناک سازش ہے، جو اسلام کی گردن کائیں کے لئے تیار نہ کی گئی۔ وہ کون سانگ انسانیت حربہ ہے، جو اسلام کے تاریخ پر بکھیرنے کے لئے استعمل نہ کیا گیا۔۔۔ وہ کون سی درندگی ہے جس کی مشق سینہ اسلام پر نہ کی گئی۔۔۔ وہ کون سے ہولناک مظلالم ہیں، جو اسلام کے نام لیواؤں پر روانہ رکھے گئے۔۔۔ لیکن جب ہندوستان پر فرستگی استعمار قابض ہو چکا تھا۔۔۔ مسلمان غلائی کی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔۔۔ کفر نے اسلام پر ایک نیا، زرا اور اچھو تاحملہ کیا۔۔۔ ایک خوناک سازش تیار ہوئی۔۔۔ ایک بھی انک منصوبہ ہا۔۔۔ جس کے تحت اسلام کو اسلام کے نام پر لوٹنے کا پروگرام ہا۔۔۔ نبی اکرم جناب محمد علیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپؐ کے نام پر لوٹا جائے۔۔۔ قرآن کو قرآن کے نام پر لوٹا جائے۔۔۔ احادیث کو احادیث کے نام پر لوٹا جائے۔۔۔ اہل بیتؐ کو اہل بیت کے نام پر لوٹا جائے۔۔۔ صحابہؓ کو صحابہؓ کے نام پر لوٹا جائے۔۔۔ حج کو حج کے نام پر لوٹا جائے۔۔۔ مکہ اور مدینہ کو مکہ اور مدینہ کے نام پر لوٹا جائے۔۔۔ اسی طرح دیگر اسلامی شعائر و اصطلاحات کو انہیں کے نام پر غارت کیا جائے۔۔۔ کفر نے اپنے اس خاص ایکشن کو "قادیانی ایکشن" کا نام دیا اور اس کی قیادت ایک تنگ دین، تنگ دنگ، تنگ انسانیت اور تاریخ انسانیت کے بدترین شخص مرزا قادیانی کو سونپ دی گئی۔۔۔ کفر نے اپنا کفریہ لباس اتارا۔۔۔ کفریہ ہتھیار توڑے۔۔۔ چہرے سے کفریہ نشان مٹائے۔۔۔ کفریہ عادات و اطوار ترک کیے۔۔۔ کفریہ چال اور کفریہ رنگ ڈھنگ کیا۔۔۔ کفر نے اجل اسلامی لباس پہنا۔۔۔ چہرے پر داڑھی سجائی۔۔۔ ماتھے پر محراب ابھارا۔۔۔ سر پر ہمامہ رکھا۔۔۔ ہاتھ میں تسبیح پکڑی۔۔۔ لبوں پر

قرآن کی آیات سجائیں۔۔۔ زبان پر اسلامی وعظ جاری کیا۔۔۔ اور بغل میں دودھاری چھری رکھی۔۔۔ اور مسلمانوں میں گھس گیا اور ایسا تحمل مل گیا کہ پہچان مشکل ہو گئی۔۔۔ پھر کفر نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔۔۔ کفر مختلف جمیتوں پر اسلامی جلسے اور دینی اجتماع کرنے لگا۔۔۔ عیسائیوں اور ہندوؤں سے مناظرے ہونے لگے۔۔۔ اسلامی کتابیں چھپنے لگیں۔۔۔ اسلامی لڑپچرپورے ہندوستان میں تقسیم ہونے لگا۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی سادہ لوح مسلمان مرزا قادریانی کو ایک اسلامی راہنمہ سمجھ کر اس کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔۔۔ یعنی مرزا قادریانی کی دکان نبوت پر پیشتاب کی بوتل آب زم کالیبل لگ کے بکٹے گئی۔۔۔ کتنے کام گوشت بکرے کے گوشت کے نام پر فروخت ہونے لگا۔۔۔ زہر تریاق کے نام پر بکٹے گئی۔۔۔ شیطنت رحمانیت کے نام پر فروخت ہونے لگی اور جنم، جنت کے نام پر بکٹے گئی۔

ثیروں نے جنگل میں مشع جلا دی
مسافر یہ سمجھا کہ منزل یہی ہے

○

الله رے دیکھنے اسیری بلبل کا اہتمام
صیاد عطر مل کے چلا ہے گلاب کا

○

حسین سانپ کے نقش و نثار خوب سی
لگاہ زہر پر رکھ خوش نما بدن پر نہ جا

○

غدار نے بھی دھار لیا روپ مسلمان
تبیع کے داؤں میں چپسی تھی تم ہے

○

وہ اک دسمبہ ہیں علم و آگئی کے نام پر
 تیرگی پھیلا رہے ہیں روشنی کے نام پر
 ہائے کتنے مسلمانوں نے مرزا قاریانی کو نبی اور سچ موعود مان لیا۔۔۔۔۔
 ہائے کتنے مسلمانوں نے اس کے بے ہودہ جملوں کو وحی تسلیم کر لیا۔۔۔۔۔
 ہائے کتنے مسلمانوں نے اس کے گندے خاندان کو اہل بیت قبول کر لیا۔۔۔۔۔
 ہائے کتنے مسلمانوں نے اس کے بے ضیر و بے ایمان ساتھیوں کو صحابہ مان لیا۔۔۔۔۔
 ہائے کتنے مسلمانوں نے قاریان کو مکہ و مدینہ تسلیم کر لیا۔۔۔۔۔

انگریزی نبی مرزا قاریانی ایک ماہر شکاری کی طرح مسلمانوں کو کپڑا رہا اور اپنی دودھاری
 چھری سے ان کے ایمان کی رگ کاشتا رہا اور انہیں اپنے نفس شیطانی میں گرفتار کرتا رہا۔۔۔۔ ان
 کے مال و اسباب لوٹتا رہا۔۔۔۔ ان کی عزتوں سے کھیلتا رہا۔۔۔۔ فرنگی اپنے شیطانی رویوٹ مرزا
 قاریانی کے "کارناموں" کو دیکھ کر خوشی سے شیطانی قہقہے لگاتا۔۔۔۔ اور جھوم جھوم کر جام پر جام
 لنڈھتا رہا۔۔۔۔۔

مسلمانوں مرزا قاریانی کے دعوئی نبوت کو تقریباً ایک صدی بیت چلی لیکن قاریانیوں کے
 دجل و فریب کا دھندا آج بھی پوری شدت سے جاری ہے۔۔۔۔ قاریانی ہمارے معاشرے میں
 جگہ جگہ گھمات لگائے اور جال بچھائے بیٹھے ہیں۔۔۔۔ اور سادہ لوح مسلمانوں کے ایمانوں کا شکار
 کر رہے ہیں۔۔۔ رسول رحمتؐ کے امتی کملانے والا قاریانیوں کی یہ سازشیں اللہ کے خلاف
 ہیں۔۔۔۔ اللہ کے نبی جناب محمد علیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہیں۔۔۔۔ اللہ کی کتاب قرآن
 پاک کے خلاف ہیں۔۔۔۔ اللہ کے دین اسلام کے خلاف ہیں۔۔۔۔۔

اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارا اللہ سے ناطہ ہے۔۔۔۔ رسول اللہؐ سے تعلق ہے۔۔۔۔ کتاب اللہ
 سے واسطہ ہے تو تائیے ہم نے اللہ تعالیٰ "اس کے رسول" معموظ اور اس کی کتاب مقدس کے
 دشمنوں، قاریانیوں کے خلاف کیا کام کیا؟ کیا جہاد و جہد کی؟ کیا آواز اٹھائی؟

اگر ہم نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا۔۔۔ تو ہم اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔۔۔ اور آئیے ہم اپنے گریبانوں میں منہ تھیز کر سوچیں کہ ہم کون ہیں؟ مسلمان یا۔۔۔؟ مسلمانوں اگر ہماری انگلی پر کوئی کٹ لگ جائے اور تھوڑا ساخون بہ نکلے تو پورے جسم میں ایک ارتقاش پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغ کے افق پر پریشانی کے بادل منڈلانے لگتے ہیں، چہرے پر تشویش کی سلوٹیں چڑھ جاتی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے غم کے گولے رقص کرنے لگتے ہیں، دل مسوں کے رہ جاتا ہے، پاؤں فوراً کسی اچھے ڈاکٹر کی طرف بھاگتے ہیں۔ زبان بے ٹکان بولتے ہوئے ڈاکٹر کو سارا قصہ غم سناتی ہے۔ اکڑا ہوا سانس اور چہرے کے اتار چڑھاڑا ڈاکٹر کی ہدر دیاں حاصل کرنے کی بھرپور کوششیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فوراً مرہم پڑی کرتا ہے، یہکہ لگاتا ہے، دوائی دیتا ہے اور پھر کندھوں پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی و تشفی دیتا ہے۔۔۔ تب کہیں جا کر جان میں جان آتی ہے۔

لیکن دوستوا آؤ ایک اور تصویر بھی دیکھتے ہیں۔

مرزا قادریانی نے ایک گھنادنی سازش کے تحت اسلام کے سرمیں ارماد کا کلمائزادے مارا ہے، جس سے چہرہ اسلام اور جسم اسلام لوٹو ہے۔

چہرہ اسلام کو خون میں تربہ تر دیکھ کر کبھی ہمارے دل پر چوتھی؟ کبھی ہمارے جگہ میں چھین ہوئی؟ کبھی ہمارے آنکھیں نمناک ہوئیں؟ کبھی ہمارا سر چکرایا؟ کبھی ہمارا دماغ مجموع ہوا؟ کبھی ہمارے اعصاب مضطرب ہوئے؟ کبھی ہمارے ہاتھ کلمائزے کی طرف بڑھے؟ اتنے بڑے سانچے پر کبھی ہماری زبان نے احتجاج کیا؟

آؤ سوچیں۔۔۔ آؤ فکر کریں۔۔۔ آؤ خود کو پر کھین۔۔۔ آؤ خود کو کھنگالیں۔۔۔ ہم کتنے ظالم ہیں؟ ہم کتنے خود پرست ہیں؟۔۔۔ اپنی انگلی کے چھوٹے سے کٹ پر اتنا برا طوفان۔۔۔ اور اسلام کے لوگوں کو دیکھ کر سکوت مرگ۔۔۔ ہائے اسلام سے یہ بے رغبی۔۔۔ یہ بے وقاری۔۔۔ یہ بے اعتنائی۔۔۔ ہمیں کہاں لے جائے گی؟۔۔۔ کہاں لے جا رہی ہے؟۔۔۔

پوچھ رہی ہے یہ جس، اہل جنوں کو کیا ہوا

دیکھ رہی ہے دیگزر، اہل وفا کدر گئے

خاکپائے مجاهدین ختم نبوت

محمد طاہر رزا ق

بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ اے (تاریخ)

۷ ستمبر ۱۹۹۵ء

نوث : اس کتاب کی تحریک میرے شفیق دوست جناب محمد فاضل اختر ملک، جناب محمد متین خالد، جناب ڈاکٹر محمد صدیق شاہ بخاری اور سید مولدار حسین شاہ میرے دست و بازو بنے رہے۔ اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں ان کا حصہ کسی طور بھی بمحض سے کم نہیں۔ میں دل کا اتحاد گمراہیوں سے اپنے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ پاک کے حضور دست بدعا ہوں کہ اللہ پاک انہیں ان کے کار خیر کا اجر عظیم عطا فرمائے اور ان کے ایمان و زندگی میں برکت مرحمت فرمائے۔ (آمین)

محمد طاہر رزا ق

اسانہ ہائے قادریانیت کی حقیقت

قادیریانیت پر لکھنے کے لئے ذہن کو اتنا پست کرنا پڑتا ہے کہ جیسے آدمی کو کسی مزیلہ کی محدود کرنی پڑے مگر محمد طاہر رzac صاحب نے اس موضوع پر اتنی بلندی تحریر دکھائی ہے کہ میرے اندر بھی ہست پیدا ہو گئی۔

انگریزی دور غلامی میں بر صغیر کی سرزی میں مختلف اسلام فتنوں کی روشنی کی کے لئے نہایت درجہ زرخیز ہو گئی۔ اس کا سب سے شاندار کر شمہ یہ تھا کہ ایک نیجے یہاں پھوٹا، وہ مبلغ ہنا، وہ مناظر ہنا اور ہندوؤں اور مشنری پادریوں کے مناظروں کے آکھاڑے جانے لگا۔ پھر وہ ایک منزل اور آگے بڑھا اور مجدد بن گیا۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال درجہ پیروی کی بنیاد پر اعزازی یا مجازی نہیں ہنا۔ پھر علی اور بروزی نبی کملایا۔ پھر الہام اور روحی کامورود ہونے کا دعویٰ کر کے مستقل اور کامل نہیں ہنا، جس پر ایمان نہ لانے والے کافر قرار پائے۔ پھر تمام اصطلاحات نبوت کو اپنے لو احتین پر بریت کر دین کو مذاق ہناریا۔ مثلاً ازواج کے لئے ام المؤمنین کے لقب مقدس کا استعمال، ساتھیوں کو صحابی (اور ان کے لئے رضی اللہ عنہ) کا استعمال، احادیث نبوت کے طریق پر اپنے "فرمودات عالیہ" کو سلسلہ روایت کے ساتھ بیان کرنا جس کا مذاق اڑاتے ہوئے ہمارے بزرگ مثل ریا کرتے تھے کہ "بیان کیا تو رے نے" اور اس نے روایت کی نبوغ مراٹن سے کہ مرزا صاحب نے فرمایا کہ نسیان اتنا بڑھ گیا ہے کہ میں کوٹ کی ایک جیب میں استنبجے کے ڈھیلے رکھتا ہوں اور دوسری جیب میں گڑ کے ٹکڑے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ میں گڑ کھانے کا ارادہ کرتا ہوں اور استنبجے کے ڈھیلے منہ میں ڈال لیتا ہوں اور دوسری طرف یوں بھی ہوتا ہے کہ استنبجے کا ڈھیلانکلنے کے بعد جائے گڑ کا ڈھیلانکل لیتا ہوں"۔

اس آفت دور اس کو پہلے تو لوگوں نے جذباتی عقیدت سے لیا کہ مخالفین اسلام کا مقابلہ اشتخاروں متابوں اور مبالغوں اور مناظروں سے کرتا ہے۔ خوب چندے جمع ہوتے اور قادریانی

نہ ہب سچیم و سخیم ہوتا جاتا۔ مگر بات جب مجد کو چلی تو بست سے لوگ کنارہ کر گئے۔ پھر جب نبوت کا جضڈا بلند ہوا تو زیادہ تعداد بے وقوف کی رہ گئی۔ میری مراد بے وقوف سے کوئی بست برے معنوں میں نہیں ہے بلکہ میں اس کا قائل ہوں کہ بست سے امیر کبیر اور پڑھے لکھے بھلے ہاں بھی کسی نہ کسی صاحب فتنہ کے پرستاروں میں شامل ہو جاتے ہیں اور ایسے بے وقوف کو بست عام سے معنوں میں احمق یا چخد نہیں کہا جاسکتا بلکہ بعض بڑے بڑے دانش و راہر عمدے دار اور دولت مند لوگ ان میں شامل ہوتے ہیں۔

تو ہوتے ہوئے آخر کار معزز اور معقول تم کے ایسے لوگ عوام کا لانعام کے ساتھ مل کر "حضرت صاحب" کے گرد جمع رہ گئے جن کی پر اسرار رُگ حمات کو کم ہی لوگ جان سکتے ہیں کہ وہ دماغ کے کس حصے میں واقع ہے۔

میرے پاس اگر وقت ہوتا تو دو ایسے قصے ضرور سناتا جن میں ایک تو حکایت لذیذ بھی ہے۔۔۔ یعنی مولانا شاء اللہ امر ترسی مرحوم کے ساتھ خاص دعووں اور پیش گوئیوں کو معیار فیصلہ قرار دے کر مناظروں میں نکلت کھانے کا قصہ اور دوسرا محمدی بیکم محترمہ کامرد افغان فیصلہ ہی نہیں، جعلی نبوت کے ساغر گلگلوں کو کچھی کچھی کرنے کا مسئلہ۔۔۔ مرزا صاحب نے وہی سنائی کہ ہمارا لکاح آسمانوں پر محمدی بیکم سے ہو چکا ہے۔ اب وہ اپنے خاوند پر حرام ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ فوراً ہماری بارگاہ نبوت میں بہ دیشیت ایک غیر ناشدہ یوہی کے حاضر ہو۔ ورنہ چند روز میں اس کا نام نہاد خاوند مرجائے گا اور تمہیں میرے پاس آنا پڑے گا۔ اس بارے میں وہی والہام کی تائیدوں کا بڑا ذہنڈور اپیٹا گیا۔ اس کے خاوند کو انتباہ دیے گئے۔ اس کی برادری میں طوفان پھا دیا گیا۔ اسی سلسلے میں ہمارے سامنے ایک راوی نے (الابا بر گردون راوی) یہ بھی بطور حدیث مرزائے قادریان بیان کیا کہ حضرت گل شیر جو لا ہے نے مولا بخش شیعہ مار سے روایت کی اور شیعہ مار نے امام دین پُواری سے روایت کی کہ "مرزا صاحب دھوپی کے گھر سے محمدی بیکم کے میلے کپڑے (جود حلالی کے لئے آتے تھے) منکوا کران کو سو نگاہ کرتے تھے"۔

تحدی یہ تھی کہ۔۔۔ محمدی بیکم کو حقی طور پر میرے گھر آنا ہو گا اور اس کے لئے مجھے خدا کی الہامات اس کثرت سے آرہے ہیں کہ اگر یہ واقعہ نہ ہو تو میری ساری بات جھوٹی، میرا الہام جھوٹا، میری نبوت جھوٹی۔ یہ میرا معیار صداقت ہے۔

غمی بیگم بھی ایسی چنان تھی کہ ان تمام دعوائے مرتضیٰ اور الہامات اور پیش گوئیوں اور خاوند کے مرجانے کی وعیدوں اور قادریانی نبوت کے کرشوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی اور پوری زندگی اپنے گھر میں امن و سکون سے گزار دی۔

جب دعاوی نبوت قادریان کا فضیحتاحد سے بڑھاتو پھر مرزا صاحب اور ان کے حواریوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اس الہامی پیشین گوئی میں سرہت ہے۔ یعنی اگر مرزا صاحب کا لکھ محدث بیگم سے نہ ہو تو مرزا صاحب کے کسی لڑکے یا اس کے لڑکے یا اس کے لڑکے سے محمدی بیگم کی لڑکی یا اس کی لڑکی سے ضرور ہو گا۔ اور ایک دن آئے گا کہ مرزا صاحب کی پیش گوئی پوری ہو جائے گی۔

اور جنت الحقائق کے عظیم دانش ورہاں مطمئن ہو گئے کہ مرزا صاحب نے حق فرمایا اور من جانب اللہ فرمایا۔۔۔ کسی کی قیمت آنکھ نہ سکھی۔

صرف یہی ایک واقعہ مرزا صاحب کے سارے طسم کو بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ آج بھی ان سے اس مسئلے پر جواب طلب کیجئے مگر ان کے لڑپچھو کو ہنائے دلیل ہنا کر۔

باتیں لمبی ہوتی جا رہی ہیں۔ انگریزوں نے یہ دیکھا کہ یہ تو بردا صاحب کمال آدمی ہے جبکہ اس کے پیرو بھی لکڑی کے کندوں کی طرح نمائیت محکم طور پر ایک ہی جگہ پڑے رہتے ہیں چاہے باد سوم چلے یا طوفان ہاراں آئے۔ اس سے کام لینا چاہیے۔

منظروں وغیرہ کے سلسلے میں مقدمے وغیرہ بھی بنتے تھے اور بعض امور کی اجازتیں لینے کے لیے ڈپی کشنز یا کسی اور عدالت افسر کے سامنے آئے دن پیش ہونا پڑتا۔ ایسے ہی موقعوں پر "اندرون خانہ" باتیں طے ہو گئیں۔ انگریزوں نے ایک ڈیوٹی تو مرزا صاحب کے پردویہ کی کہ لوگوں کو جہاد کے تصور سے ہٹائیں کہ یہ قلم کا زمانہ ہے۔ اب تکوار کے بھائے دلائل اور بحثوں سے معاملات چکائے جاسکتے ہیں وہی سبق اب فنڈ امتنی ازم اور سیاسی اور حملہ اور اسلام کے خلاف مسلمانوں کے لیڈروں کو پڑھایا جاتا ہے۔ دوسرا کام یہ سونپا کہ اطیعوالله و اطیعو الرسول واولی الامر منکم کی آیت کے آخری حصے کا مطلب یہ سمجھایا جائے کہ جو لوگ بھی تمہارے حاکم بن جائیں ان کی اطاعت لازمی ہے۔ تیری خدمت یہ کہ لوگوں کو سیاسی بھگتوں سے دور رہاؤ اور وعظوں، مناظروں، بحثوں وغیرہ میں مصروف رکھو۔

چو تھا فریضہ یہ کہ مختلف مسلمان گروہوں اور اسلامی لیڈروں وغیرہ کی حرکات اور سرگرمیوں کی رپورٹیں ہمیں پہنچاتے رہو۔

یوں مرزا صاحب کو طاغوتی قوت کے عرش تک معراج حاصل ہو گئی۔

ان خدمات کے ساتھ اس شخص اور اس کے مریدوں کو آج دنیا کی مسلم دشمن طاقتیں ملت اسلامیہ (خصوصاً پاکستان کے خلاف) جاسوی اور سالوی طریقوں سے تباہ کن جنگ چیزیں ہوئے ہیں۔

اس فتنہ کے خلاف بہت کچھ لکھا اور بولا گیا۔ اضطرابات ہنگام کے سلسلے میں تحقیقاتی عدالت کی کارروائی کا ہزاروں صفحوں کا ریکارڈ بھی وجود میں آیا۔ مسلمانین پاکستان اور پیشتر اسلامی ممالک نے ان کو غیر مسلم بھی قرار دے دیا۔ مگر ان کی فتنہ پر دا زیاد طرح طرح سے جاری ہیں۔

مگر یہاں کی عالمی مجلس تحفظ فتح نبوت مسلسل میں کے جانشینوں کے تعاقب میں ہے اور بہت سے اور ادارے اور اشخاص بھی کام کر رہے ہیں۔

اسی سلسلے میں محمد طاہر رzac جو کام کر رہے ہیں، حیرت ناک ہے۔ اس وقت ان کی ایک کتاب "قادیانیت" دوسری "قادیانیت شکن" جوان کے مخفتوں کے مجموعے ہیں اور تیسرا کتاب "نغمات فتح نبوت" جس میں اسلامی ولی شعرا کا کلام قادیانیت کے متعلق پیش کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے عنوانات اور نقرے بہت تنوع رکھتے ہیں اور شوفی و خوش مذاقی بھی اور اراق تحریر میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں ان کے لطیف و دلکش جملے نقل کر سکوں۔ کتابوں کی کتابت، طباعت، کانگز، جلد گرد پوش اچھے معیار کے ہیں۔ تبلیغی مقصد کے لئے قیمتیں بھی کم۔۔۔ رکھی گئی ہیں۔

محمد طاہر رzac کی دنیاگی ایج کے کیا کہنے ہیں کہ انہوں نے قادیانیت کو (جو خود ایک دلکش افسانہ اور افسانوں کا مجموعہ ہے) افسانوں کی سکرین پر بھی پیش کر کے حیرت زدہ کر دیا ہے۔ سبق آموز کمانیاں (بلکہ واقعات) اس طسم کا پرده فاش کرتے ہیں۔

میرے سامنے اس وقت حسب ذیل افسانوں کے پہنچت ہیں ((۱)) "اور چور پکڑا اگیا" (۲) "جموہ" (۳) "جسم سے فرار" (۴) "تفیر عثمانی" (۵) "وفا" (۶) "مردود کیس کا" (۷) "جال"

(۸) "۵ ہزار" (۹) "نوح" (۱۰) "ایسا بھی ہوتا ہے" (۱۱) "اور پھری مکمل ہو گئی" (۱۲) "تری تصویر دیکھ کر"۔

مفہوم کے سرور قوں کے یک رنگ ڈیرائیں فن کا اچھا نمونہ ہیں۔ افسانوں کی تجھنیک مناسب ہے۔ قصہ، آغاز، عروج اور نتیجہ بہت عام فہم طریق سے سامنے لائے گئے ہیں۔ زبان اور مکالے دلچسپ، کہیں عیاری، کہیں تعجب، کہیں انکشاف حقیقت کی کیفیات بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد قادریانیت کی حقیقت ایسی مٹکشf ہوتی ہے کہ پھر کوئی سادہ لوح اس کے جال میں قدم نہیں رکھ سکتا۔
اب میں مختصر اچندر افسانوں کی روح پنجھڑ کر سامنے رکھتا ہوں۔

تیری تصویر دیکھ کر

ایک نوجوان، بخارب یونیورسٹی لاہور میں ایم۔ اے کے درجے میں داخل ہوا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک قادریانی طالب علم تھا۔ تعلقات بڑھائے، تبلیغ شروع کروی۔ دعویٰ میں اور سیر پاٹنے ہوتے رہے۔ قادریانی نے اسے بہشتی مقبرے کا بھی نظارہ کرادیا۔ حتیٰ کہ شکار پھندے میں پھنس گیا۔ گھروالوں کو اس کے ذہنی اور ایمانی سفر کا حال معلوم نہ تھا۔ وہ فارغ ہو کر گھر آیا تو اس کے کتابوں کے گھر میں سے قادریانی لزور پر لکھا۔ اس کا والد کانپ گیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ قادریانی ہو گیا ہے۔ اس کا والد ٹھیک بجموکا ہو کر اسے گھر سے نکالنے کا حکم دینے والا تھا۔ اس کے بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں نے والد سے کہا کہ ذرا امبر سمجھئے۔ ہم علماء سے بات کریں گے اور معاملہ حل ہو جائے گا۔

قادریانی، گھر سے شادی کا انتظام کرنے کے لیے لاہور میں آیا۔ پھر تے پھرتے فیروز منزکی دکان پر پہنچا۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے اس کی نظر "محسن انسانیت" (سیرت پاک حضور) پر پڑی۔ وہ کتاب اس نے خریدی اور بغور مطالعہ شروع کیا۔ کتاب میں جب تفصیلت کا وہ باب آیا جس میں حضور پر نور کی صورت مبارک کا نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے شوق ہوا کہ مرز اصحاب کی تصویر کو دیکھئے۔ سامنے ہی قادریانی ستر تھا۔ وہاں سے جا کے وہ تصویر لایا مگر گمرا کر غور سے دیکھنے کے بعد اسے پھینک دیا کہ یہ کسی نبی کی صورت نہیں ہو سکتی۔

سارے گھر میں خوشی کا رنگ پھیل گیا۔

اور چور پکڑا گیا

اسلم کمال نے اپنی بیٹی کا رشتہ ڈاکٹر مبشر قادریانی کے ساتھ کر دیا۔ شادی کے دن نکاح کے وقت جب مولوی صاحب نے کلہ طیبہ کا ترجمہ دو لاما کو پڑھایا تو اسے یہ ترجمہ ہتھیا کہ "محمد اللہ کے آخری رسول ہیں" لڑکا جھوکا۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ باپ نے کماکہ اس موقع پر جو مولوی صاحب کہیں، وہی کہہ دو۔ اب مولوی صاحب کو شک ہوا۔ انہوں نے دو لاما سے کہا "یہ بھی کہو کہ حضرت محمد اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور ان کے بعد جو دعویٰ نبوت کرے، وہ کافر ہے"۔ دو لاما پھر چونکا۔ گویا کسی نے سینے میں تیر مار دیا ہو۔ دو لاما کے باپ نے کماکہ "ہم کسی کو کافر نہیں کہتے"۔

مولانا کی نظر لڑکے کے باپ کی انگوٹھی پر پڑی جس پر کھاتھا الیس اللہ بکاف عبدہ اس آیت کے ساتھ انگوٹھی پہننا قادریانی شعار ہے۔

مولانا نے دائیں طرف بیٹھے اسلام کمال کو رازداری سے کان میں کماکہ لڑکا اور اس کا غاندان قادریانی ہیں۔ تمام متعلقہ عزیزوں نے بھی بات سنی اور غور کر لیا۔ مولانا نے اسلام کمال اور ان کے عزیزوں کے پاس جا کر سب کو مبارک بادوی کہ اللہ پاک نے آپ پر خصوصی کرم کیا ہے اور آپ کی بچی کی عزت کو کافروں سے بچالیا۔ بقیہ تفصیلات ہم نے چھوڑ دی ہیں۔

اور سخری تکملہ ہو گئی

اس کا ضروری مکمل اخلاقیہ ہے:

اب مجاہدین نے جیل ڈل کے ایک ہاؤس بوٹ کو گھیر لیا۔ اس میں کمانڈوز چھپے ہوئے تھے۔ کمانڈر خالد نے کمانڈوز کو ہتھیار پھیکے کا حکم دیا۔ جواب نہ ملنے پر اندر داخل ہونے لگا تو ایک اسرائیلی کمانڈر نے اس پر کلاشنکوف کا فائر کھول دیا۔ وہ سخت زخمی ہو گیا مگر بچت ہو گئی۔ زخمی حالت ہی میں خالد نے کمانڈوز پر جو ای فائز کر کے اسے ڈھیر کر دیا۔ اسرائیلی کمانڈوز ہاؤس بوٹ میں دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ کمانڈر خالد نے دستی بموں سے تباہ کرنے کی

وارنگ دی۔ اس پر اسرائیلی کمانڈوز نے خود کو مجاہدین کے حوالے کر دیا۔

ان کو باندھ کر، آنکھوں پر پٹی جتا کر انہیں خفیہ مقام تک لے جایا گیا۔ پوچھ گئے شروع ہو گئی۔ ان کے جسموں کے رنگ کو سانولاد کیا کر کمانڈر خالد نے پوچھا کہ تم لوگ صرف انگریزی، اردو اور پنجابی بول سکتے ہو۔ اس وجہ سے مجھے کچھ شک ہے۔ ہلکے تشدید کے بعد انہوں نے صحیح بات کہہ دی کہ وہ قادریانی ہیں اور ان کا تعلق پاکستان سے ہے۔ وہ اسرائیلی فوج میں باقاعدہ بھرتی ہیں، جہاں جملہ ایک ہزار قادریانی موجود ہیں جو جاسوسی اور فوجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں اعلیٰ عمدوں پر جو قادریانی بیٹھے ہیں، ہمارے ان کے ساتھ مسلسل رابطے ہیں۔

افسانے کا آغاز و اختتام ہم نے چھوڑ دیا ہے۔

ان دو تین مثالوں سے اندازہ کر لیں کہ ۱۲ افسانے کس طرح حقائق قادریانیت کو فاش کرتے ہیں۔ نیز اس سلسلے میں مزید معلومات مجلس تحفظ ختم نبوت، نکانہ صاحب، ضلع شیخوپورہ سے حاصل کریں۔

نیعم صدیقی

۳۰۔ ۷۔ ۹۵

”اپنی ذات میں انجمن“

اب یہ بات صیغہ راز میں نہیں رہی بلکہ کھلا اشتخار بن گئی ہے کہ قادریانیت اُنگریز کا خود کاشتہ پُدا اور شش جہات پھیلے ہوئے استعمار کا شیطانی منصوبہ ہے۔

قادیریانی ذریت کی دیگر سازشوں اور ضرر رسانیوں سے قطع نظر اس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے امت کی محبت، اطاعت اور وفاداری کا مرکز بدلتے کی نفرت اُنگریز کو شش کی ہے۔ چودہ صدیوں پر محیط امت مسلمہ کی تاریخ میں جس امر پر مطلق اور غیر مشروط اجتناب رہا ہے، وہ ہے ذات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تاقابل تقیم محبت، دل کی اتحاد گمراہیوں کے ساتھ اطاعت اور غیر متزلزل عهد و فا۔

بِ مصطفیٰ بر سارِ خویش را کہ دیں ہم اوس

اُگر باو نہ رسیدی تمام بو لہبی است

امت چودہ صدیوں میں عروج و زوال کے کئی مرتضویوں سے گزری ہے۔ کبھی بالائے بام اور کبھی بیتلائے آلام رہی ہے۔ کامران و کامگار بھی رہی اور رہیں تھیں ہائے روزگار بھی اس کی بلندیوں نے ٹریا کو چھووا ہے اور اس کی پستیوں نے ٹری میں بسیرا کیا ہے۔ کبھی اس نے مروماہ کو صید زیوں بنائے رکھا اور کبھی فلک نے اس کا جھنڈا اسرگوں کیے رکھا۔ یہ اتار چڑھاؤ اس امت کی تاریخ کا حصہ رہا ہے۔ زمانے کے موجز نے اس کا تخت و کلاہ تو چھینا ہے لیکن مرکز نگاہ نہیں بدل سکا۔ اس کی سلطوت و عظمت تو پالم ہوئی ہے لیکن جذبہ حب رسول ”آمادہ زوال نہیں ہوا۔ صلیبی جنگیں ہوں یا فتنہ تamar، یہ امت ڈوب کر ابھری ہے تو صرف ایک نام کے سارے اور وہ ہے نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم।

قادیریانیت نے امت کی چودہ صدیوں کی تاریخ مسخ کرنے کی سازش کی ہے۔ بناہ بریں قادریانی بیک وقت ارتداء، بغاوت اور مجرمانہ سازش کے مرکب ہوئے ہیں۔

علامہ اقبال ”نے بڑی حکیمانہ بات کی کہ نئی قادریانی امت کے اجراء اور اس فکر کی ترویج کا سب سے بڑا نقصان یہ ہو گا کہ مستقبل میں اسلام کی صحیح تصویر کی شافت مشکل ہو جائے

گی۔ کیونکہ جو غیر مسلم (بزعم خویش) ان کے توسط سے اسلام قبول کرے گا، وہ اس اسلام کو صحیح اور برحق سمجھنے پر بجور ہو گا۔ اس لئے کہ اسے یہی سمجھہ بتلایا جائے گا۔ اس طرح اسلام کی دو تعبیریں بن جائیں گی اور امت کے اندر ایک مستقل فتنہ بپار ہے گا۔

ایک خط میں پنڈت نسو نے حضرت علامہ "کو لکھا تھا کہ "آپ جیسا روشن خیال اور ماڈرن مفکر بھی قادر یانوں (احمدیوں) کو غیر مسلم سمجھتا ہے۔ سمجھنے اس پر بڑی حیرت ہے"۔ اس کے جواب میں حکیم الامت "نے بہت خوبصورت اور ایمان افروز بات فرمائی تھی۔ "پنڈت جی! آپ کے نزدیک جو نہ ہب کا اور کسی نہ ہبی اوتار اور رشی کا تصور ہے، آپ اس کی روشنی میں سمجھنے ہی نہیں سکتے کہ مسلمانوں کا اپنے دین اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تعلق اور کس درجے کی وابستگی ہے"۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اگر مسئلہ قادر یانیت کو اس رخ سے دیکھا جائے تو اس کی ہولناکی، عجینی اور کراہت بہت بڑھ جاتی ہے اور اس کا اور اک جتنا جلد ہو جائے، امت کے حق میں اتنا ہی مفید ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو نہی اس فتنے نے سراخھایا، اس کی سرکوبی بھی اسی دن سے شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اس سلسلے کی عجینی جوں جوں بڑھتی گئی اور اس سازش کے ریشے جوں جوں میں الاقوامی سطح تک پہلتے گئے، اسی حساب سے اس کے مدارک اور تعاقب کا دائرہ بھی وسیع تر ہو ساگیا۔ علماء اور مشائخ تو شروع دن سے اس کے درپے رہے لیکن اب سیاسی اور علمی و ادبی حلقوں میں بھی اس پاپک وجود سے گھن اور نفرت کا اظہار بر طلاق کیا جا رہا ہے۔

اسی سلسلے میں میرے محب مکرم جناب محمد طاہر رzac کا نام بہت مبارک اور نمایاں ہے، جو تن تھا اتنا کام کر رہے ہیں، جس قدر ایک ادارہ اور آکیڈمی کام کرتے ہیں۔ اسی لئے میں انہیں "اپنی ذات میں انجمن" کا درجہ دیتا ہوں۔

آج ہر شخص غم روزگار میں بال بال الجھا ہوا ہے۔ غم جاہاں کی کے فرصت ہے؟ لیکن میرے مددوچ طاہر رzac صاحب غم دوران کے ساتھ ساتھ غم جاہاں سے بیک وقت رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ ان کے جذبات، ان کے احساسات اور ان کے خیالات سن کر، دیکھ کر اور پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ سرکبٹ مجہد ہیں، جو ہر وقت ہتھیار بند رہتے ہیں اور ان کے چہرے سے

یہ عزم جھلکتا ہے کہ چاہے سارا شہر اس میدان سے بھاگ جائے، مگر وہ اس قادریانی لشکر سے تنا
لڑیں گے۔ نہ بیز فائز کریں گے، نہ ہتھیار ڈالیں گے اور نہ پیغہ دے کر بھاگیں گے۔
انہوں نے ”نغمات ختم نبوت“ مرتب کیے اور کمال محنت اور محبت سے انہیں رنگ
روپ دیا۔ ”قادیانیت شکن“ کتاب ترتیب دی، جس سے قادیانیت کے ماتحت پر مولیٰ مولیٰ
شکنیں ابھر آئی ہیں۔

”تحفظ ختم نبوت“ کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر وہ گرزہ تھوں میں لے
کر قصر ختم نبوت کے دروازے پر چاق و چوبند کھڑے ہیں کہ کسی نے اس میں داخل ہونے کے
لیے دلیز کے پہلے زینے پر بھی قدم رکھا تو یہ اس کا سر پھوڑ دیں گے۔ بلکہ اس کی ہڈیاں توڑ دیں
گے۔ اب ہمارے دوست ”قادیانی افسانے“ کے عنوان سے کتاب طبع کرا رہے ہیں۔ ان کا
خیال ہے کہ مختصر لفظوں اور تھوڑے سے وقت میں لوگوں کو قادریانی فتنے کے بارے میں
معلومات میا کی جائیں ہا کہ کوئی یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم قادریانی ذریت سے اس لیے آگاہ نہ
ہو سکے کہ ہمارے پاس ضخیم کتابیں پڑھنے کا وقت نہ تھا۔

”جسم سے فرار“، ”تیری تصویر دیکھ کر“ اور ”چور پکڑا گیا“ جیسے برجستہ اور چست
عنوانات آپ کو اس کتاب میں ملیں گے اور ہلکے ہلکے انداز میں قادریانیوں کے بھاری اور گھرے
جرائم کا سراغ ملے گا۔

جناب طاہر رzac کی زبان میں شدت اور قلم میں حدت آپ کو ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ
دلی اور لکھنٹو کی زبان پڑھنے کے عادی و حشت محسوس کریں مگر میں کوئی وحشت محسوس نہیں
کرتا۔ اس لیے کہ بات اگر ہو مرتقا قادریانی کی تو لکھنٹو کی زبان کماں سے آئے؟ گنجائش کا ذکر ہو
تو بخاری و موطا کے صفحے کون پڑھے گا؟ شیطان رجیم کی حرکات نوٹ کرنے کے لیے کوشش و تنسیم کا
لجد کماں ملے گا؟ قلب امت میں خبر گھونپنے والے سے معاملہ ظاہر ہے تیر و نشرت سے ہو گا، سو
یہی کچھ ہمارے دوست نے کیا ہے۔ بلبل کا دل جلنے گا تو چمن سے بوئے کتاب ضرور آئے گی۔
صاجزادہ خورشید احمد گیلانی

محمد طاہر رzac---نئے عہد کا فسانہ نگار

قادیانیت کا دام ہرنگ زمیں تخویف و تحریص کے ہفت رنگ دھاگوں سے بنا ہوا ایک ایسا جال ہے جو نوکری، چھو کری اور فروٹ کی نوکری کے ذریعے نوجوانوں کو پھانتا اور انہیں مرزا غلام احمد علیہ ماعلیہ کی اس نام نہاد ظللی و بروزی نبوت کو مانے پر مجبور کرتا ہے جس کا عملی اور فعلی طور پر مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے نکال کر مرزا غلام احمد کی چاکری میں دے دیا جائے اور یوں بالواسطہ طور پر انہیں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقابلے میں ایک ایسی نئی امت کا فرد ہتایا جائے جو اس سیستھدارِ رضی پر بنے والے تمام مسلمانوں کو ایک نبی کے نہ ماننے کی وجہ سے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتی ہے اور ان کے ساتھ مصاہیرت و منکوت کے رشتؤں کو جو زنا اور ان کا جنازہ تک پڑھنا حرام سمجھتی ہے اور اس پر اس حد تک تشدید اور انداز میں عمل کرتی ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں آنجمنی نے بیانے قوم حضرت قائد اعظم علیہ الرحمہ کا جنازہ تک پڑھنے سے صریح اعراض کرتے ہوئے جو گندرا ناقہ منزل کے ساتھ کھزارہنے کو ترجیح دی اور جب ان سے پوچھا گیا کہ جناب آپ نے یہ حرکت کیوں کی تو انہوں نے نہایت ڈھنائی اور دیدہ ولیری سے کہا کہ مجھے ایک کافر حکومت کا مسلمان وزیر یا ایک مسلمان حکومت کا کافرو وزیر سمجھ لیا جائے۔ یہ جواب ان جوابات کے مقابلے میں انتہائی "زم" اور "شاستہ" ہے جو خود مرزا غلام احمد اور ان کی "زریت طیبہ" نے ایسے سوالات پر دیے ہیں۔ دنیا میں کوئی نبی ایسا نہیں گزر اجس نے اپنے مخالفین پر گن کر اور کئی کئی صفحات پر لکھ کر، سوسا اور ہزار ہزار لغتیں بھیجی ہوں۔

مرزا محمود احمد اور ان کے الیسی لاڈ شکر نے تو پھر اس سے بھی وقدم آگے بڑھا کر مسلمانوں کو دہلی کی تکالی زبان میں ایسی ایسی گالیاں دی ہیں کہ تلنے نہر کے پتواری میر ناصر

نواب (بر عکس نہند نام زنگی کافور) اور ان کی صاحبزادی اللہ رحمی المعرف نصرت جماعت یقین بھی انہیں سن کر چوکڑی بھول گئی ہوں گی۔ ”ہندوؤں کا خدا تعالیٰ سے دس انگلی یونچ ہے“ کے بعد اگر امیر شریعت، خطیب جلیل اور لسان اسلام سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے متعلق مرزا محمود احمد کی یہ مکروہ ترین بد زبانی پڑھیں کہ اگر ان کے والد محترم کو علم ہو تو اس کے گھر ایک ایسا بچہ پیدا ہو گا جو حضرت مسیح موعود کی مخالفت کرے گا تو وہ اپنا آکھ تنازل کاٹ دیتا تو کوئی جیرانی نہیں ہوتی“ اور اگر ان ساری ہفتوات یا المفہومات و اہمیات کو پڑھ کر اس کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے کسی کی زبان میں کسی قدر تلمیز آ جاتی ہے تو اس کا جواز موجود ہے۔ قادیانی فرقی میسنوں کے انداز میں کس طرح کام کرتے ہیں اور جس چابک دستی، عیاری اور مکاری کے ساتھ مسلمانوں تی کو دامانِ مصطفیٰ کی ٹھنڈی چھاؤں سے نکال کر ربوبہ کی چاپلاتی دھوپ اور بے آب دگیہ خشک پہاڑیوں کے دامن میں واقع ”دو زخمی مقبرہ“ میں لے جانے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ظاہر رزاق کے افسانے ”جال“ مردود کہیں کا ”نوح“ تیری تصور یہ دیکھ کر، ۵ ہزار ”جھونٹا“ اور چور پکڑا گیا“ میں پڑھیں تو آپ کو خوب پتے چل جائے گا کہ قادریانیوں کا طریقہ واردات کیا ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل میں محض اپنی رحمت اسے باندھ کر نہیں رکھ سکتی اور وہ لامحالہ اس ”جنم سے فرار“ انتیار کر کے رہے گا۔ انسانہ حقیقت کی اس انداز میں عکاسی کرنے کا نام ہے کہ ہر قاری یہ محسوس کرے کہ ”زبان یہ سا ہے، بات ان کی“ یاد کیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ مانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور جس طرح پورے دوثق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلام عباس کے آندی اوہ اور کوٹ کے پڑھے بغیر ہم اپنے معاشرے کی مناقتوں کو اپنے سامنے عربان نہیں دیکھ سکتے، سعادت صن منشو کی ”غلطی“، ”ثوبہ نیک سنگھ“ بلکہ پورا منشو نامہ، منثور اما کامطالعہ کیے بغیر تفہیم بر صغیر کے وقت جنم لینے والی بے یقینی، مذہبی و فرقہ وارانہ تھصب، وحشت و درندگی کا پورے طور پر احاطہ کیا جا سکتا اور احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ پاس کے پھول ”کو دیکھے بغیر ہم دھن عزیز کے دیہاتی پس منظر کو سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ ممتاز مفتی کے ”رام دین“ پر نظر ڈالے بغیر عورت کی نفیات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بات بھی بلا خوف تردید کی جا سکتی۔ ہے کہ

دین سے شفعت رکھنے والے مسلم نوجوان اگر قادریانیت کو اس کے اصل روپ میں دیکھنا اور جانتا چاہتے ہیں تو پھر انہیں محمد طاہر رzac کے افسانوں کو پڑھے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں۔ یہاں میں بر سبیل تذکرہ یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ محمد طاہر رzac میں ایک بت بڑا افسانہ نگار بالقویٰ چھپا بیٹھا ہے۔ اس لیے میرا انہیں مشورہ ہے کہ وہ اپنا کیوس دسج کریں۔

قادریانیت کا علمی و فکری دل جل تو اس بات سے ہی کھل جاتا ہے کہ مرزا غلام احمد پرلے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ کو آسمانوں پر زندہ تسلیم کرتا رہا مگر جب انہیں یہ پتہ چل گیا کہ اس طرح ان کی اپنی "نبوت" معرض خطر میں رہے گی تو اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو باہم کے حوالوں کی آڑ میں بے نقطہ نائیں اور پھر ان کی موت کا اعلان کرنے پر ہی اکتفا نہیں بلکہ سری گمراہ کشمیر کے محلہ خانیار میں یوز آسف کی قبر کو ان کی قبر قرار دے کر خود مسیح و مددی ہونے کا دعویٰ کر دیا اور قادریانی امت نے کروڑوں روپے سالانہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ثورن کے ایک گرجا گھر میں موجود ایک جعلی کفن کو اصلی ثابت کرنے پر ضائع کر دیے اور اب جب کہ نیشنل جیوگرافی اور ریڈرز زدیجسٹ نے یہ راز طشت از بام کر دیا ہے کہ یہ نام نہاد کفن بھی قادریانی نبوت کی طرح جعلی ہے تو ہر قادریانی دریائے جیرت میں غوطے کھا رہا ہے اور جب یہ بات آڑے آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو کبھی اپنے آپ کو ایک پہلو سے امتی اور ایک پہلو سے نبی کہا۔ کبھی بروزی و ظلی نبوت کی اصطلاحات اپنے لیے استعمال کیں۔ کبھی لم یبق من النبوة الا المبشرات کے تحت اپنے آپ کو صرف انفوی معنوں میں نبی قرار دیا۔ حالانکہ یہ ساری اصطلاحات صوفیا نے صرف مجددین کے لیے استعمال کی ہیں اور زیادہ سخت اور کثر علماء نے تو انہیں بھی شلطیخیات صوفیاء کے زمرہ میں شمار کر کے ان کے استعمال سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ گو مرزا غلام احمد کی تحریرات میں یہ کشفیوں اور بے ربطی اس وجہ سے ہے کہ وہ باقاعدہ درسی و مکتبی علم سے آرائش نہیں تھے لیکن کبھی یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ وہ اندر سے ہر وقت خوفزدہ رہتا تھا اور یہ جانتے ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعویٰ نبوت سراسر خلط اور بے بنیاد ہے اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کمیں پکڑانہ جاؤں اور یہی وہ خوف ہے جو اسے کسی کل جیں نہیں لیتے دیتا تھا اور وہ اپنی

نبوت کی ایسی توجیہیں کرتا تھا کہ عقل جیران و ششده رہ جاتی ہے کہ آخر یہ شخص کہنا کیا چاہتا ہے۔ نبی تو اپنے وقت کا سب سے فصح المлан انسان ہوتا ہے اور امام شافعی علیہ الرحمۃ تو زبان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی وسعتوں گمراہیوں اور پہنائیوں کو سوائے نبی کے کوئی جان ہی نہیں سکتا تو پھر یہ کیا نبی ہے جس کونہ خود سمجھ آرہی ہے کہ اس نے کیا کہنا ہے اور نہ وہ دوسروں کو سمجھانے کی الہیت و صلاحیت سے سرفراز ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مرزا غلام احمد میں نبوت کی صلاحیت و اہمیت ہی موجود نہیں تھی۔

مولانا عبد اللہ سندھی سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ نور الدین تو پڑھا لکھا آدمی تھا اور اس کے مقابلے میں مرزا غلام احمد کچھ بھی نہ تھا۔ پھر اس نے یہ کیا جھک ماری کہ مرزا غلام احمد کو صحیح موعود مددی موعود اور نہ جانے کیا کچھ مان لیا تو مولانا سندھی نے سائل کو کہا کہ تمہارے اسی سوال میں اس کا جواب پوشیدہ ہے کہ ادعیا اور دعوے کے لیے جہالت شرط ہے اور یہ حضرت مرزا غلام احمد میں تمام و کمال موجود تھی۔ اب رہا نور الدین کا مرزا غلام احمد کو مان لینا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ابوالفضل اور لیفی کو کسی نہ کسی اکبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر یہ صلاحیت و الہیت کے فقدان ہی کاشاخانہ تھا کہ مرزا غلام احمد کو نبی بنانے کے لیے تشریعی اور غیر تشریعی نبوت کی اصطلاحات گھٹری گھٹیں ورنہ ہر نبی صاحب شریعت ہوتا ہے۔ خواہ اس کی شریعت چند احکام پر مبنی ہو یا نبی سابق کی شریعت کے بعض احکامات کی ترمیم و تنقیح پر مشتمل ہو۔ اس لیے جب ہر نبی کے صاحب کتاب ہونے کا مسئلہ سامنے آیا تو پھر مرزا غلام احمد کے الہامات کے مجموعہ کو ”تذکرہ“ کے نام سے چھاپ کر اسے الہامی کتاب کا درجہ دینے کی کوشش کی گئی۔ کبھی ”کشتی نوح“ کو یہ منصب دینے کی سعی کی گئی۔ پھر مرزا غلام احمد کی روایات کو سیرہ المددی کے نام سے تین جلدیوں میں شائع کر کے اور باقی کو خوف فساد خلق کی وجہ سے رجڑ روایات کے نام سے جمع کر کے یت الخلافت لا بہریری میں جمع کر کے انہیں نعوذ بالله احادیث کا مقام دینے کی کوشش کی گئی اور انہیں شروع بھی اس انداز سے کیا گیا کہ ”بیان کیا مجھ سے فلاں بن فلاں نے۔“ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ کیا یہ حدثاً فلاں بن فلاں کا پاک چرچہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قادریانیت دجل و تبلیس کا ایک وسیع شیطانی چکر ہے۔ لیکن جن قادریانیوں کے دلوں پر اللہ نے مر لگادی ہے، انہیں یہ بھی سمجھ نہیں آرہی کہ مرزا محمود احمد کے

بعد مرزا ناصر احمد اور اس کے بعد مرزا طاہر احمد کا آتا اور نام نہاد خلافت کی رویڑیوں کا ایک بھی خاندان میں تقسیم ہوتا، طاقتور کا اپنا حصہ چھین کر لے جانا اور مرزا رفیع احمد کا مرزا طاہر احمد کو کتنا کرنے کے باوجود وہاں سے نکلنے کا حوصلہ نہ کرتا ہی پیر پستی اور گدی نشینی کا وہ جلال ہے جو پوپ کی جائشی کے لئے بنائے گئے قواعد و ضوابط کے تحت محض ایک خاندان کی عیاشی کے لئے بنایا گیا ہے اور باقی قادریانی محض مذہبی ہاری ہیں اور ان کا کام اپنے خون پینے کی کملائی سے جیتے جی اور مرنے کے بعد بھی اس خاندان کو چندہ اکٹھا کر کے دینا ہے تاکہ وہ لندن کے "اسلام آباد" میں بیٹھ کر گھرے اڑاتا رہے۔ میں اب نئے عمد کے افسانہ نگار محمد طاہر رزان اور آپ کے درمیان حائل نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے ان کے افسانوں کو خود پڑھ کر جائزہ لیں اور دیکھیں کہ قادریانیت کیا ہے؟

شفیق مرزا

روزنامہ "جنگ" لاہور

۲۰-۹-۹۵

نقاب کشا

بارہ عدد نسخی منی کتابیں میرے سامنے پڑی ہیں..... ابھی ابھی ان کتابوں کو پڑھ کر فارغ ہوا ہوں۔ کتابوں کے مصنف محمد طاہر رzac صاحب ہیں۔ کمانیوں کے انداز میں یہ کتب دراصل ختم نبوت کے موضوع پر ہیں..... یہ موضوع جس قدر اہم بلکہ اہم ترین ہے..... ہمارے علمائے کرام نے اس موضوع کو اسی قدر پس پشت ڈال دیا ہے۔ نوجوان نسل کو اول تو معلوم ہی نہیں کہ مسئلہ ختم نبوت ہے کیا..... مرزا سیت کیا ہے، وہ کس کس طرح نوجوان نسل کو یا سادہ لوح لوگوں کو اپنے جال میں پھانستے ہیں.....؟ جنہیں کچھ معلوم ہے، وہ اس حد تک ناکافی ہے کہ قادریٰ ہتھ کنڈوں کے جواب نہیں دے سکتے..... ان حالات میں یہ کوشش لا جواب ہے..... اس لیے بھی کہ دینی کتب آج کے دور میں نوجوان نسل کے لیے پڑھنا بست مشکل سا کام ہے..... جب کوئی ٹاؤں، گمانی یا رسالہ ہاتھ لگ جاتا ہے تو اس کا مطالعہ فوراً شروع کر دیا جاتا ہے..... ایسے لوگوں کو دین کے اس پہلو سے روشناس کرانے کے لیے یہ نسخی منی کتب عجیب ہیں..... اور پھر چونکا دینے والی ہیں..... خاص طور پر "تفیر عثمانی" پڑھ کر تو میں چونکہ ہی اٹھا ہوں..... "۵ ہزار" پڑھ کر بھی حیرت زدہ رہ گیا..... اگرچہ ختم نبوت کے اوارے سے مسلک ہوئے قرباً بارہ سال گزر گئے لیکن آج بھی بست سے گوئے ایسے ہیں کہ جب اچانک وہ سامنے آتے ہیں تو چونک جاتا ہوں.....

یہ بارہ کتب نوجوان نسل کو ہو شیار کرنے اور چونکا نے کام احسن طریقے سے کر سکتی ہیں..... اللہ تعالیٰ محمد طاہر رzac صاحب کو جزاۓ خیر دے۔ (آمین)

اشتیاق احمد

اپنی بات

ادب اور ابلاغیات کی دنیا میں افسانہ اور کمانی یہیشہ کلیدی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ کیونکہ کمانی سننے کا وہ عمل جو مار کی گود سے شروع ہوتا ہے، وہ موت کی آہٹ تک ساتھ رہتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کبھی انسان کمانی سناتا ہے، کبھی خود سنتا ہے، کبھی کمانی پڑھاتا ہے اور کبھی پڑھتا ہے۔ سننے سننے پڑھنے پڑھانے کے عمل سے گزر کر آخر انسان اک دن خود کمانی بن جاتا ہے۔ کمانی کے کروار سدا زندہ رہتے ہیں، بس وقت، نام و مقام بدلتے رہتے ہیں۔ ہماری اس دنیا میں ہمارے ارد گرد بکھری بے شمار کمانیوں میں اک انوکھی، ابھی اور الٹی کمانی کا نام "قادیانیت" ہے۔ جس نے اپنا "جال" پہنچنے سو برس سے ہمارے ماحول میں اس طرح پھیلا رکھا ہے کہ انجانے میں بے شمار پہنچی اس کاشکار ہو کے رہ گئے۔

صیاد نے جال تو ڈالا، مگر بعد میں پیار کیا، آزاد کیا، دانہ ڈالا، پالی پلایا، سایہ دیا۔ انسوں نے سوچا چلو آرام ہوا اور وہیں لمبی تان کر سور ہے اور ان کے ہی ہور ہے مگر کچھ ایسے بھی تھے کہ جن کے جب پر کٹنے لگے تو ان کا ماتھا ٹھنکا تو پھر یہ پہنچی جب وہاں سے بھاگے تو کوئی کہہ رہا تھا "مردود کمیں کا"۔ کسی نے کہا "چور پکڑا گیا"۔ کسی نے "جوہنا" کہا کسی نے اسے "جنم سے فرار" سے تشبیہ دی۔ کوئی "نوہ" کرتا اپس آیا تو کسی نے آنکھ کھلنے پر آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے "وفا" کا عمد پختہ کر لیا۔ کسی نے واپسی پر "5 ہزار" کی کمانی سنائی تو کسی نے "تفیر عثمانی" کی اور کسی کا بس نہ چلا تو وہ صیاد کے گروکی تصویر پر لعنت بھیجا ہوا ہی چلا آیا اور آنے والوں یا ان کے چاہنے والے مجہدوں میں جو بڑے دل کے مالک تھے، انسوں نے تو نہ صرف خود شکاری کاشکار کیا بلکہ اس شکار کی "سینگری" بھی مکمل کر لی اور جب شکاری نے پوچھا یہ کیا؟ تو انسوں نے کہا "ایسا بھی ہوتا ہے"۔

"جال" سے لے کر "ایسا بھی ہوتا ہے" تک کی تمام کمانیاں "قادیانی افسانے" کے نام

سے آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ دیگر کمانیوں کی طرح ان کے کداروں کے نام و مقام بھی فرضی ہیں۔ مگر کمایاں اصلی اور صحی ہیں۔

ہو سکتا ہے آپ بھی کسی ایسی کمانی کا کدار رہے ہوں یا ہونے والے ہوں یا نہ بھی ہوں۔ تب بھی آپ کی آگئی، شعور اور رہنمائی کے لیے یہ خوبصورت کتاب حاضر ہے۔ ارتقا کی منزلیں وہی تیزی سے طے کرتا ہے جو دوسروں کے تجربہ سے سیکھ سکے۔ ان معصوم اور مظلوم لوگوں کی کمانیوں سے خود بھی سبق سیکھنے اور دوسروں کو بھی سبق سکھائیے۔

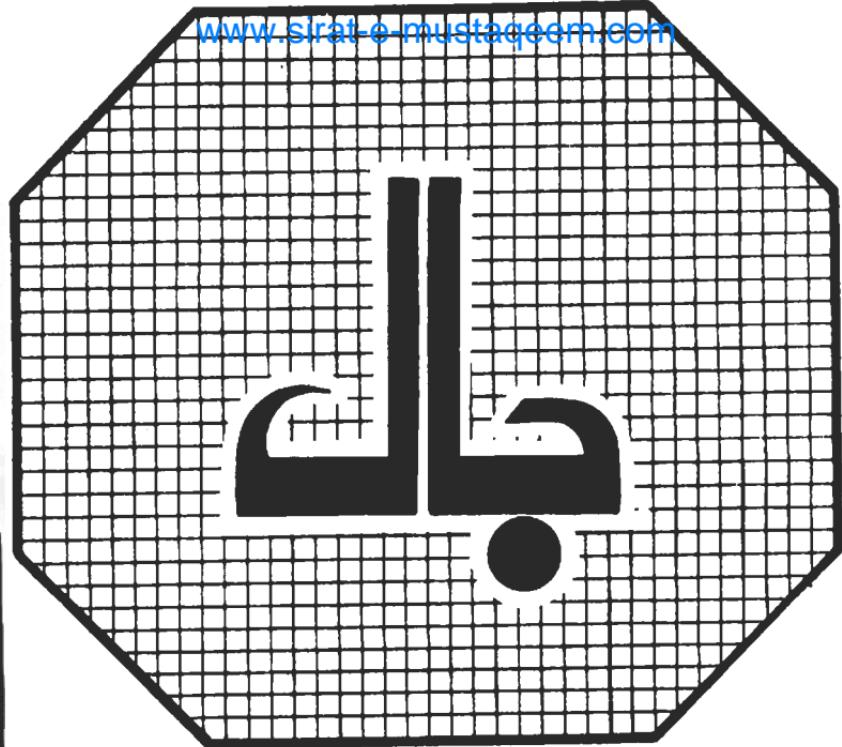
قادیانیت کے گندے جو ہر میں اتر کر ان کداروں کو قریب سے دیکھنا اور ان کی سازشوں کو طشت از بام کرنا یقیناً اسی مجاہد کے بس میں تھا جس کے سفر کا آغاز "تحفظ ثُمَّ نبوت" تھا اور جو اب "نعمات ثُمَّ نبوت" اور "قادیانیت شکن" کی منزلیں طے کرتا "رو قادیانیت" کی تاریخ میں یہ پہلا اور منفرد کام لے کر ایک دفعہ پھر آپ کے دلوں پر دستک دے رہا ہے۔

درود اکجھے اور محمد طاہر رzac کی لگن، جذبے، فکر، خلوص اور محبت پیغمبر ﷺ کو سلام کیجھے۔ ہو سکتا ہے مجاہد کے حضور ہمارا یہ سلام ہماری بخشش کا باعث بن جائے۔

غبار راہ طیبہ

فیاض اختر ملک، لاہور

۲۹ ستمبر ۱۹۹۵ء



○ قادیانیوں کی ایک خطرناک میاہش کی راز افشا۔
○ ایک خطرناک سوچن کا علاج ہے جس کا منی و عمل فرنہ ہے۔
○ ایک بہت سی افسوسوں کی کاش جوں جاں چال کو
توڑ کر اس پر نہیں کامیاب ہو گیا۔
○ ایک بہتر بار افسوس جس کا حمن تھا تو سے ملاماں ہے۔

عمران مطہری اور احمد ناصر ملک

تکمیل مطہری اور احمد ناصر ملک ڈاکٹر 2329

وہ چوبیس برس کا جوان رعنًا تھا۔ نام محمد جمیل، جواس کے حسن صورت کا عکاس تھا۔ وہ باغنوں اور کالجوں کے شر لا ہور میں پلا ڈھنا تھا۔ اس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس کے والد ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھے۔ لیکن طویل بیماری کی وجہ سے انہیں ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ گھر کا سارا بوجہ اس کے کندھوں پر آن پڑا۔ وہ شام کو لوگوں کے گھروں پر جا کر شوشن پڑھا کر بڑی مشکل سے گھر کی وال روتی چلتا۔ والد کی دوائیوں کے لئے اکثر اسے دوستوں سے ادھار انھانا پڑتا۔ جس کی واپسی اس کے مسائل میں زبردست اضافہ کرتی۔ اسے جوان ہوتی بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے کا بھی فکر تھا۔ وہ نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ ہنچا ب پبلک لائبریری جا کر اخباروں کے پلندوں میں سے ملازمت کے اشتراکات ڈھونڈتا۔ جس دن کوئی اشتراک مل جاتا، وہ فوراً درخواست دینے کے لئے متقلقه دفتر میں پنج جاتا۔ وہ درخواستیں اور انٹریویو زدے دے کر تھک گیا لیکن اسے نوکری نہ ملی۔ کیونکہ اس کے پاس کسی ایم پی اے یا ایم این اے کی سفارش نہ تھی۔ وہ کسی وزیر یا مشیر کا رشتہ دار نہ تھا۔ اس کی جیب میں کسی راشی افسر کو روشن دینے کے لئے خطیر رقم نہ تھی۔ ایک دن اس کے والد کے ایک انتہائی قربی دوست نے اس سے کہا کہ بیٹا جمیل! آج تم میرے دفتر آنا، میں نے ایک دوست سے تمہاری نوکری کی بابت بات کر رکھی ہے۔ انشاء اللہ تمہاری نوکری کا بندوست ہو جائے گا۔ وہ صبح خوشی خوشی اپنے والد کے دوست کے آفس پہنچا اور دوپہر دو بجے تک اپنے والد کے دوست کے پاس بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ لیکن مذکورہ شخص نہ آیا۔ وہ کئی دن تک ان کے آفس میں چکر لگاتا رہا لیکن سوائے ناکامی کے کچھ نہ ملا۔ ایک دن وہ انتہائی افرادگی کے عالم میں پڑھردا چرے کے ساتھ، تھکا ہارا دفتر کی سیریزیاں اتر کے گمراہ رہا تھا کہ سیریزیوں میں اسے ایک بوڑھا شخص ملا جس کا انداز تکم بڑا دھیما، میٹھا، چرے پر فرنچ کٹ داڑھی اور ہاتھ میں ایک مخصوص انگوٹھی تھی جو اس سے قبل اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس شخص نے بڑی محبت و چاہت سے اس سے ہاتھ ملایا اور خنده پیشانی سے نیست۔

دریافت کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا تعارف کرتے ہوئے کہا کہ میں اسی دفتر میں سپرنزندنٹ کے عمدہ پر فائز ہوں۔ آپ کو کئی دفعہ پریشانی کے عالم میں دفتر میں آتے دیکھ کر میں نے آپ کے میزبان سے پوچھا تھا کہ برخوردار کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟ تو آپ کے میزبان نے بتایا تھا کہ آپ ملازمت کے سلسلہ میں پریشان ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی پھرتی سے پوچھا کہ کیا بنا آپ کی ملازمت کا؟ جیل نے ماہیوس لجھ میں نہیں میں جواب دیا تو اس شخص نے اسے تھکلی دیتے ہوئے کہا کہ بیٹا! فکر مت کرو۔ تم مجھے بالکل اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہو۔ میں تمہاری پریشانی کا سن کر خود پریشان ہو جاتا تھا۔ آج صبر کا یارا نہ رہا تو تمہیں راستے میں روک کر حالات کی بابت پوچھ لیا۔ بوڑھا شخص نمایت شفقت سے اس کے ساتھ میں ہاتھ ڈال کر اسے آفس کی کنٹینر میں لے گیا، بڑی پر ٹکلف چائے پلائی اور ساتھ ساتھ پیار بھرے لجھ میں میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔ بوڑھے کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد جیل اس سے یوں منوس ہو گیا جیسے کئی برسوں سے گھری دوستی ہو۔

چائے سے فراغت کے بعد بوڑھے نے جیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا! تمہاری ملازمت کا کام تو پکا ہو گیا اور نوکری بھی معمولی نہیں بلکہ بہت اعلیٰ ہو گی اور چند ہی مہینوں میں تمہارے حالات یکسر بدلتے جائیں گے۔ بوڑھے کے یہ محبت بھرے الفاظ سن کر جیل کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سر سے ٹوں وزن اتار دیا اور اس کا بدن گلب کے پھول کی طرح ہلاکا چلاکا ہو گیا۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں بوڑھے کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ بوڑھے نے کہا، بیٹا! شکریہ کی کیا ضرورت! دکھی لوگوں کے کام آتا میری زندگی کا نصب العین ہے۔ اس کے بعد بوڑھے نے اپنی جیب سے اپنا وزینگ کارڈ نکلا اور اس کی پشت پر ایک شخص کے نام رنگ لکھ دیا۔ بوڑھے نے جیل سے کہا کہ تم یہ کارڈ لے کر ریوہ چلے جاؤ۔ میرا یہ کارڈ فلاں شخص کو دینا وہ فوراً تمہاری ملازمت کا بندوبست کر دے گا۔ جیل نے جب بوڑھے سے پوچھا کہ ریوہ کیا ہے تو بوڑھے نے جواب دیا کہ ریوہ چنیوٹ شر سے بذریعہ بس صرف پندرہ

منٹ کا سفر ہے۔ جیل نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کمال احتیاط سے کارڈ اپنی جیب میں ڈالا اور خوشی میں پھولانہ ساتا ہوا مگر روانہ ہو گیا۔ اس نے گھر جاتے ہی یہ خوشخبری اپنے والدین اور بھنوں کو سنائی۔ سارے گھر میں خوشی کی ایک زیبادت لہر دوڑ گئی اور جیل کو ایڈو انس مبارک ہادیں ملنے لگیں اور ملھائی کا مطالبہ ہونے لگا۔ ہستا مسکراتا جیل اگلے دن ریوہ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اگلی صبح وہ نما دھو کر تیار ہوا اور والدین سے اجازت لے کر گھر سے چل پڑا۔ ویکن شینڈ پر پہنچا، لکھ خریدا اور ویکن میں بیٹھ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو ویکن ایک صاف ستھری شاہراہ پر فرائے بھرتی ہوئی ریوہ کی جانب رواں تھی۔ جوں جوں ریوہ قریب آ رہا تھا اسے اپنی منزل قریب آتی دکھائی دے رہی تھی۔ ساڑھے تین گھنٹے میں ویکن نے اسے ریوہ پہنچا دیا۔ جیل ویکن سے اتنا رواں سے منہ ہاتھ صاف کیے، لباس کو درست کیا، جیب سے کنکھا نکال کر سہری بالوں میں پھیرا اور قریب ہی کھڑی ویکن کے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی اور مسکرا کر رہ گیا۔ ضروری سامان والا بیگ کندھے پر لٹکایا اور ایک قریبی دکاندار سے کارڈ میں درج پتے کی بابت پوچھا۔ بالاخلاق دکاندار نے بڑی تسلی سے اسے پتہ سمجھا دیا۔ جیل بڑے بڑے قدم اٹھاتا ہوا، جست پتے پر پہنچ گیا۔ یہ ایک بہت بڑا دفتر تھا جس کے باہر قصر خلافت لکھا تھا جس میں لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ سب کی شکلیں عجیب و غریب اور آپس میں بڑی ملتی جلتی تھیں۔ جیل انہیں دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے ایک شخص کو روک کر اس سے کارڈ میں درج نام والے شخص کے بارے میں پوچھا۔ وہ شخص اسے بڑی الفت سے ملا اور پھر اسے ساتھ لے جا کر ایک کمرہ کے باہر لکھی کے نیچ پر بٹھا دیا اور دروازے کے باہر کھڑے چوکیدار سے کہا کہ یہ شخص آپ کا مسماں ہے۔ جیل نے بڑھے کا کارڈ چوکیدار کو دیا۔ چوکیدار کارڈ لے کر اندر گیا اور جلد لپک کر باہر آگیا اور جیل کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جیل خود کو سیٹ کرتا ہوا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندر گھونٹنے والی کری پر بیٹھے شخص نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال

کیا اور بڑے احترام سے کری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جمیل شکریہ کہہ کر کری پر بیٹھ گیا۔ جمیل نے بیٹھتے ہی ایک نظر گما کر کمرے کا جائزہ لیا تو کمرہ میں قیمت فرنچز، قالین اور پردوں سے آراستہ تھا۔ اب جمیل نے غور سے جو اس شخص کو دیکھاتے چونک اخھا کہ اس شخص کی بھی بوڑھے کی طرح فرجع کٹ داڑھی اور انگلی میں وہی مخصوص انگوٹھی تھی۔ لیکن اس نے خود پر زبردست قابو رکھتے ہوئے کسی احساس کو ظاہرنہ ہونے دیا۔ جمیل نے نظر اخھا کر سامنے جو دیکھاتو اسے اس شخص کی پشت کی طرف دیوار پر ایک شخص کی شیشے کے فریم میں بہت بڑی تصویر نظر آئی۔ جمیل نے تصویر کی طرف جو بغور دیکھاتو اسے صاحب تصویر بڑا عجیب و غریب نظر آیا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی بڑی تھیں۔ ایک آنکھ تو تقریباً بند ہی تھی۔ داڑھی کے بال انگھے ہوئے، سر پر سکھوں والی گپڑی، موٹے موٹے ہونٹ، موچھوں کے بال منہ میں پڑے ہوئے، لیکن جمیل نے اس کو بھٹک کا مارا ہوا لہنگ سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور وہ پوری طرح کری پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ کری پر بیٹھا ہوا شخص ہلکا ہلکا مسکراتا ہوا جمیل سے کہنے لگا۔

”آپ کی آمد کی اطلاع مجھے کل ہی مل گئی تھی اور میں آج آپ کا مختصر تھا۔ آپ کی ملازمت کا بندوبست ہو چکا ہے۔ ہم آپ کو اپنے خرچے پر جاپان بھیجنیں گے۔ جمال آپ کی تنخواہ چھیٹیں ہزار پاکستانی روپے ہو گی۔“

”مجھے کب جانا ہو گا؟“ جمیل نے پوچھا۔

”جب آپ کی مرضی“۔ کری پر بیٹھے شخص نے جواب دیا۔

جمیل خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی کے راستے سے مسائل کے بھاری بھر کم پتھر ہتھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مستقبل میں ایک خونگوار زندگی کی خوبیبو سوگھ رہا تھا۔ وہ تصور کی دنیا میں اپنی بہنوں کی شادیاں کر رہا تھا۔ بیمار باپ کا علاج کسی بہترین ہسپتال میں کرو رہا تھا۔ بوڑھی والدہ کو جمیل بیت اللہ کروا رہا تھا۔ قرضوں کے طوق گلے سے اترتے ملاحظہ کر رہا تھا اور خود اپنی آئندہ زندگی کے حسین

پہنچے دیکھ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں جھکیں اور تصوراتی ماحول سے حال میں واپس آیا اور اس نے کرسی پر بیٹھے مخفی کا بڑے زور دار انداز میں شکریہ ادا کرتے ہوئے، دوبارہ ملنے اور جاپان روائی کے پروگرام کے بارے میں پوچھا تو وہ مخفی گویا ہوا۔

”مسٹر جیل! ہم آپ کا اتنا بڑا کام کر رہے ہیں کہ اس کام کی بدولت آپ کی زندگی کے سارے کام ہو جائیں گے لیکن اس کام کے لئے ہماری بھی کچھ شرائط ہیں،“ جنہیں آپ کو پورا کرنا ہو گا۔“

”کون سی شرائط ہیں جناب؟“ جیل نے جیرانی سے پوچھا۔

”آپ کو مجھے لکھ کر دینا ہو گا کہ آپ قادریانی ہیں۔“ کرسی پر بیٹھے مخفی نے میز پر پھل مارتے ہوئے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”اسی بنیاد پر تو آپ باہر جائیں گے۔“

”وہ کیسے؟“

”آپ کو درخواست میں لکھتا ہو گا کہ میں ایک قادریانی ہوں۔ پاکستان میں ہماری جان، مال اور عزمیں محفوظ نہیں۔ یہاں کی حکومت اور مسلمانوں نے ہماری زندگی اچیجن کر رکھی ہے۔ ہمارے مردوں کو قید کیا جا رہا ہے۔ ہمارے مکانوں اور عبادت گاہوں کو نذر آتش کیا جا رہا ہے۔ ہمارے اموال کو لوٹا جا رہا ہے۔ ملازمتوں کے دروازے ہم پر قطعاً بند ہیں۔ لہذا مجھے انسانی حقوق کی بنیاد پر جاپان میں سیاسی پناہ دی جائے۔ دنیا کی انسانی حقوق کی کمیٹیوں سے ہمارے گھرے رابطے ہیں۔ ان کمیٹیوں کے تعاون سے ہم نے حکومت جاپان کو پاکستان میں قادریانیوں کے ساتھ ہونے والے اس ظالمانہ سلوک کے بارے میں قائل کر لیا ہے اور جس مخفی کی تقدیق ہم کروں، اسے جاپان میں پناہ مل جاتی ہے۔ صرف جاپان ہی نہیں، بہت سے دیگر ممالک مثلاً مغربی جرمی، ناروے، کینڈا وغیرہ کو بھی ہم نے پاکستان کے ان حالات کی وجہ سے

اپنے آدمیوں کو سیاسی پناہ دینے پر قائل کر لیا ہے۔ اس وقت ان ممالک میں ہمارے
بھیجے ہوئے ہزاروں آدمی اربوں ڈالر کارہے ہیں اور عیش و عشرت کی زندگی گزار
رہے ہیں۔ آپ بھی ایک قدم آگے بڑھائیے۔ خوشیوں سے بھری زندگی آپ کے لئے
چشم براہ ہے۔ آپ صرف قادریانی ہونے کا اقرار کر لیں اور کمرے میں گلی ہوئی یہ
تصویر ہمارے نبی جناب مرزا قادریانی صاحب کی ہے انہیں نبی تعلیم کر لیں، ہم آپ کی
درخواست کی تقدیق کر دیں گے۔ جب آپ جاپان پہنچیں گے وہاں ایئر پورٹ پر ہمارا
آدمی آپ کے استقبال کے لئے موجود ہو گا۔ وہ جانانی انتظامیہ کو تقدیق کر دے گا کہ
آپ واقعہ ” قادریانی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ شخص آپ کی رہائش اور ملازمت کا
ہندوبست بھی کر دے گا۔ اس سے بڑھ کر ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟“

”پاکستان میں آپ نے قادریانیوں پر ہونے والی جن زیادتوں کی نشاندہی کی ہے، یہ
سب جھوٹ ہیں۔“

”آپ زیادہ گرامی میں نہ جائیں۔ آپ اپنے روشن مستقبل کی جانب دیکھیں۔
جب آپ کے پاس نئی نویلی کار ہو گی، بہترن کوٹھی ہو گی، رنگین فلی وی، وی سی آر،
فریچ اور دیگر جدید میشینوں سے آپ کا گھر آراستہ ہو گا، تو کرہا کر آپ کی خدمت کے
لئے حاضر ہوں گے۔ آپ کے پچھے اعلیٰ سکولوں میں تعلیم حاصل کریں گے اور آپ کا
ایک بہت بڑا بیک بیلنس ہو گا۔ جلدی فیصلہ کیجئے، جاپان کی ہوائیں اور فھائیں آپ کا
انتظار کر رہی ہیں۔“

جیل اس تھے در تھے گھٹاؤنی سازش کو سمجھ چکا تھا۔ اس کے دل میں جذبات کا
ایک سمندر موجزن ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرفی الہ آئی تھی اور اس کے
ماتھے پر غصے سے جھریاں چڑھ آئی تھیں۔ وہ کرسی پر بیٹھے شخص کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر گر جدار آواز میں کرنے لگا۔

”میں اسلام فروش نہیں ہوں، میں عقیدہ فروش نہیں ہوں، میں ملت فروش
نہیں ہوں، میں وطن فروش نہیں ہوں، میں اسلام سے دغا نہیں کر سکتا، میں محمد علی

صلی اللہ علیہ وسلم سے جفا نہیں کر سکتا۔ میں عقیدہ ختم نبوت سے بغاوت نہیں کر سکتا، میں دین کی منشی کو فروخت نہیں کر سکتا، میں حرم کے ہاتھوں سے پاکستان کا منہ کالا نہیں کر سکتا۔ میں تحریک پاکستان کے شداء کی روحوں کو تو پھانسیں دیکھ سکتا۔ میں غریب ضرور ہوں لیکن باکردار ہوں، باوقار ہوں، میری حب النبی زندہ ہے، میری حب الوطی نہ زندہ ہے، میری حب الاسلام پا نہ زندہ ہے، میری فیرت نے ابھی کفن نہیں پہنا۔ میری حیث ابھی لاش نہیں بنی۔ میری انا ابھی درگور نہیں ہوئی۔ میں تمہارے انگریزی نہیں پہ لعنت بھیجا ہوں۔ میں تمہارے جاپانی ویزے کو پائے خوارت سے محکراتا ہوں۔۔۔ میں اس بھی چوڑی تنخواہ پہ تھوکتا ہوں۔ تم اس ملک کے غدار ہو، تمہارا محاسبہ کیا جائے گا۔ تمہارا مقابلہ کیا جائے گا۔ تمہاری اس سازش کو طشت ازہام کیا جائے گا۔ ریشمی دھاگوں سے بننے ہوئے تمہارے اس جال کو تار تار کیا جائے گا۔ تمہارا یہ جال کتنے لوگوں کے ایمانوں کا مقتل ہنا؟ تمہارے اس جال کی رسیوں کے پھندے سے کتنے لوگوں کے ایمانوں کو پھانسی دی گئی؟ انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں نیست و نابود کر دیا جائے گا۔۔۔ جمیل بڑی گرجدار آواز میں بول رہا تھا اور اس کے سامنے قاریانی سردی میں غمیرے ہوئے سانپ کی طرح کری پہ بیٹھا ہوا تھا۔ جمیل شدید غصہ میں کمرے سے اٹھا اور زور زور سے پاؤں مارتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ سڑک پہ آکر وہ دیگن میں سوار ہو کر عازم لاہور ہوا۔ جب وہ گمراہ پہنچا تو سورج ڈوبنے میں چند منٹ باقی تھے۔ وہ دروازہ کھلکھلانے لگا تو اسے گمر سے زور دار قہقتوں کی آواز آئی۔ اس نے دروازہ کھلکھلایا۔ دروازہ کھلا تو جمیل نے دیکھا کہ اس کی ہمیشہ کے ہاتھ میں مٹھائی کا ذوبہ ہے اور وہ انتہائی خوشی میں مبارک باد کے ساتھ اپنے بھائی کو مٹھائی پیش کر رہی ہے۔ جمیل سخت پریشان ہو جاتا ہے۔

”کیسی مبارک باد؟ کیسی مٹھائی؟“ جمیل نے پوچھا۔

”آج صبح تمہارے جانے کے دو تین گھنے بعد اباجی کے وہی دوست آئے اور ان کے ہاتھوں میں تمہارا ”اپ ائٹ منٹ لیئر“ تھا اور تمہیں ستر ہویں سکیل میں نوکری مل

چکی ہے۔ اس کی ہمیشہ نے بتایا۔
یہ حیران کن خبر سن کر جیل کی آنکھوں میں خوشی و تفکر سے آنسو آگئے جو اس
کی پلکوں پر موتی بن کر جھلملانے لگے اور اس کی زبان پر قرآن مجید کی یہ آیت جاری
ہو گئی۔

وَاللَّهِ خَيْرُ الرَّازِقِينَ

اور اللہ بہتر رزق دینے والا ہے

www.sirat-e-mustaqeem.com



عاليٰ مجلس تضييق نبوغ

مسٹر اسلم کمال کی کوئی نہیں برقی روشنیوں سے جگھا رہی تھی۔ گھر کی پوری فضا ڈھونک اور شادی کے گیتوں سے گونج رہی تھی۔ مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ کوئی کے ایک کونے میں دلکشیں پک رہی تھیں، جن کی خوبیوں سے اروگرد کی فضائیں ایک عجیب مہک رپی بی تھی۔ کوئی کے سامنے کاروں کی ایک لمبی قطار تقریب کے حسن میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

آج اسلام کمال کی اکلوتی بیٹی شینہ کی رسم مندی تھی۔ اسلام کمال ایک ٹینکشاں مل مڑیں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس نے انہیں دنیا کی ہرنعمت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ شینہ کے علاوہ ان کے دو بیٹے تھے۔ دونوں بیٹے امریکہ میں بطور ڈاکٹر کام کر رہے تھے۔ اسلام کمال کو اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے اسے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور یونیورسٹی میں ایم۔ اے تک تعلیم دلائی تھی۔ اسلام کمال نے بیٹی کے یونیورسٹی آنے جانے کے لیے پیش کار اور ڈرائیور کا بندوبست کر رکھا تھا تاکہ ان کی لاڈلی بیٹی کو بسوں اور دیگنوں کے دھکے نہ کھانے پڑیں۔

شینہ نے بھی اپنی سلیقہ شعاراتی اور قابلیت سے باپ کے دل کو خوشیوں کا گھوارہ بنارکھا تھا۔ گھر میں نوکر چاکر ہونے کے باوجود وہ باپ کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کر کے ایک روحانی خوشی محسوس کرتی۔

اسلام کمال کے ساتھ والی کوئی ایک ڈاکٹر کی ملکیت تھی، جسے وہ کرانے پر دیے رکھتا۔ ایک سال قبل وہاں ایک فیملی رہائش پذیر ہو گئی۔ فیملی کا سربراہ، جس کا نام منور احمد تھا، ایک انسورنس کمپنی میں افسر تھا۔ نئے آنے والے ہمارے کو خوش آمدید کرتے ہوئے اسلام کمال نے ان کی پر ٹکلف دعوت کا اہتمام کیا تاکہ دونوں خاندانوں کا تفصیلی تعارف ہو سکے۔ پھر یہ تعارف ایک گھری دوستی میں بدل گیا۔ تھائے کے تباولے ہونے لگے۔ پند مہینوں بعد یوں محسوس ہوئے لگا کہ دونوں خاندانوں کے برسوں پر ائے تعلقات ہیں۔

ایک سال وہاں رہنے کے بعد منور احمد کی ساہیوال ٹرانسفر ہو گئی۔ دونوں خاندانوں کو ٹرانسفر کا بڑا غم ہوا۔ انہیں ایک دوسرے سے پچھڑتے ہوئے ایک شدید دھپکا لگ رہا تھا۔ اسلام کمال نے منور احمد اور اس کے خاندان کو الوداعی کھانے کی دعوت دی۔ دونوں خاندانوں نے ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بیٹے دونوں کی محبت بھری باقی اور یادوں کا تذکرہ

ہوا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مسز منور احمد نے مزا اسلام کمال سے کہا کہ ”ہم اتنا عرصہ آپس میں بہائیوں کی طرح رہتے اور اب میرا دل چاہتا ہے کہ اس تعلق کو یہی شہ کے لیے قائم کر لیں اور اس کے ساتھ ہی مسز منور نے اپنے بیٹے مبشر احمد کے لیے ان کی اکتوبری بیٹی شینہ کا رشتہ مانگا۔“ مزا اسلام کمال نے کہا کہ ”وہ اپنے خادم سے مشورہ کر کے جواب دے گی۔“ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد مزا اسلام کمال نے ساری بات اپنے خادم کو بتائی۔ میاں یوسی نے ہر پلو سے رشتہ پر خوب غور و خوض کیا اور دو دن بعد مسز منور احمد کے شدید اصرار پر ہاں کر دی۔ مبشر احمد، منور احمد کا برباد بیٹا تھا اور فیصل آباد میں بطور ڈاکٹر کام کر رہا تھا۔ بات پکی ہونے کے بعد منور احمد کا خاندان سا یہاں وال شفت ہو گیا اور اس طرح دو خاندان ایک قریبی بندھن میں بندھ گئے۔

کل دوپہر مبشر احمد کی بارات آرہی تھی۔ اگلے دن جب سپیدہ سحر نمودار ہوا تو اسلام کمال نے نماز فجر ادا کرنے کے بعد اپنا سراپنے مالک کے حضور رکھ دیا اور گزر گذا کر اللہ سے اپنی بیٹی کے مستقبل کی خیریت کی لمبی دعائیں۔ دعا مانگنے کے بعد اس کے قلب کو ایک طہانتیت حاصل ہو گئی اور وہ نہی خوشی شادی کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ مہمانوں کے لیے سارے انتظامات کامل ہو چکے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے دوپہر بارات پہنچ چکی تھی۔ مہمانوں کو بخانے کے لیے کوئی کمپ کے وسیع لان میں قطاروں میں جگی کریاں مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ دو لہاء کے لیے ایک بڑا سچن تیار کیا گیا تھا، جسے خوبصورت قالینوں اور صوفوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ سفید شلوار قیص اور سفید اپن پہنے، پاؤں میں سنہری کھسے اور سر پر سفید اور سنہری کلاہ رکھے، فوجی بینڈ کی دھنوں میں مبشر احمد سچن کی جانب پلا آ رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ اس کے والد اور بائیں طرف اس کے دوستوں کا بھکھشا پلا آ رہا تھا۔ اسلام کمال اور خاندان کے بزرگوں نے بارات کا انتہائی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ مہمانوں کے بیٹھتے ہی ٹھنڈے مشروبات سے ان کی تواضع کی گئی۔

اسلام کمال چار پانچ دن قبل محلے کی مسجد کے خطیب صاحب سے نکاح پڑھانے کا کہہ چکے تھے۔ جمعہ کی نماز کے فوراً بعد نکاح اور اس کے بعد کھانا پیش کرنے کا پروگرام تھا۔ مسجد میں نماز جمعہ ڈیڑھ بجے ہونا تھی۔ مہمانوں کی تواضع کے بعد اسلام کمال نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے مسجد میں چلے گئے۔ جب اسلام کمال مسجد میں پہنچے تو انہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ مسجد میں نمازوں کی تعداد پہلے سے دو گنی سے بھی زیادہ ہے۔ پوری مسجد اور پہنچ سے فل ہو چکی

تھی کہ باہر سڑک پر بھی صفوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ اسلام کمال نے دیکھا کہ آج جمعہ کی تقریر کوئی اور مولوی صاحب کر رہے ہیں اور محلے کے خطیب سامع کی حیثیت سے پاس بیٹھے ہیں۔ خطیب صاحب کی خطابت میں بلا کی جوانی اور روانی تھی اور وہ حاضرین کے دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچنے ہوئے تھے۔ ان کی نکت آفرینیوں سے سامعین عش کراحتتے۔

جب وہ کسی بات کے نقطہ عروج پر پہنچتے تو مسجد رزور نعروں سے گونج اٹھتی۔ جب انہوں نے تقریر ختم کی تو وہ تمام حاضرین کے دلوں پر اپنا نقش بھاچکے تھے۔ اسلام کمال بھی مولانا صاحب کی خطابت اور ان کے دینی جذبے سے بہت متاثر ہوا۔ نماز کے بعد اس نے محلے کے خطیب صاحب سے پوچھا کہ یہ مولانا صاحب کون ہیں؟ خطیب صاحب نے بتایا کہ یہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی راہنماء مولانا محمد اکرم طوفانی صاحب ہیں۔ یہ سرگودھا سے تشریف لائے ہیں اور ہم نے جمعہ پڑھانے کے لیے انہیں دعوت دی تھی۔ اسلام کمال خطیب صاحب سے درخواست کرنے لگا کہ مولانا محمد اکرم طوفانی صاحب سے درخواست کریں کہ وہ میری پنجی کا نکاح پڑھادیں۔ یہ میرے لیے بہت بڑی سعادت ہوگی۔ خطیب صاحب نے مولانا محمد اکرم طوفانی صاحب سے نکاح پڑھانے کی التماس کی، جو انہوں نے قبول کرلی۔

اسلام کمال بڑے احترام سے مولانا محمد اکرم طوفانی کو ساتھ لے کر شیخ پر پہنچا اور دلماء کے ساتھ صوفہ پر بھاڑیا۔ نکاح شروع ہوا تو مولانا محمد اکرم طوفانی نے دلماء سے کہا کہ پڑھو:

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدُ رَسُولُ اللَّهِ“

دولما نے مولانا کے پیچے کلمہ طیبہ پڑھا۔

پھر مولانا نے اس سے کہا کہ اب کلمہ طیبہ کا ترجمہ پڑھو۔

”اللَّهُ كَرِيمٌ لَا يَعْبُدُ نَبِيًّا—مُحَمَّدٌ الرَّسُولُ كَرِيمٌ“

مولانا نے پھر دولما سے کہا کہ اب پڑھو

”اللَّهُ كَرِيمٌ لَا يَعْبُدُ نَبِيًّا—مُحَمَّدٌ الرَّسُولُ كَرِيمٌ“

آخری رسول کا جملہ سنتے ہی دولما کچھ ٹھیک سائیگا اور اس کے تپور بدلتے جیسے اس یہ جملہ ناگوار سا گزر ہو۔ کچھ دیر تامل کے بعد دولما نے مخصوص نظردوں سے اپنے والد کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو باپ نے آنکھ کے اشارے سے بینی کو کہا کہ پڑھ جا۔ بینا باپ کے کہنے پر سارا جملہ پڑھ گیا۔

مولانا عیقق نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور شیک کا ایک بھاری پھران کے

دل پر لگا تھا۔ اس شیک کی صورت حال کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے دو لہاسے کما کر پڑھا:

”محمد اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور ان کے بعد جو دعویٰ نبوت کرے وہ کافر ہے۔“

دو لہا پھر چونکا جیسے اس کے کلبے میں تیر لگا ہو۔ اس نے پھر سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔ لیکن اس مرتبہ باپ نے اس کو اجازت نہ دی، بلکہ خوب بولا اور کہنے لگا:

”مولوی صاحب! ہم کسی کو کافر نہیں کہتے۔“

مولانا کا شیک مزید رپا ہو گیا اور انہوں نے دو لہا سے کما کر پڑھا:

”میں جناب محمد رسول اللہ کے بعد ہر مدعا نبوت کو کافر مانتا ہوں اور مرتضیٰ قاریانی، جس نے دعویٰ نبوت کیا، اس کو بھی کافر اور مرتد مانتا ہوں۔“

دو لہا چپ رہا۔ دو لہا کا باپ پھر کہنے لگا:

”مولانا! ہم کسی کو کافر نہیں کہتے۔ آپ ان فضول بحثوں کو چھوڑیں۔ لڑکے نے سب کے سامنے علبی میں کلمہ پڑھ لیا ہے۔ ترجموں کے جنجال میں کیا جانا۔ آپ جلدی جلدی نکاح پڑھائیں۔ نیکی کے کاموں میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکے ہیں۔“

مولانا کا شیک تصدیق میں بدل چکا تھا۔ اچانک مولانا کی نظر لا کے کے باپ کے ہاتھ کی انگلی میں پہنی انگوٹھی پر پڑی، جس پر ”الیس اللہ بکاف عبدہ“ لکھا ہوا تھا اور یہ قادیانیوں کی مخصوص انگوٹھی ہوتی ہے۔ اسلام کمال اور لڑکی کے عزیز داتا قارب مولانا کے دائیں طرف بیٹھے تھے اور وہ ساری باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ مولانا نے اسلام کمال کو اپنے پاس بلا یا اور کان میں رازدارانہ انداز میں کما کر لڑکا اور اس کا خاندان قادیانی ہے۔ اسلام کمال نے اپنی قربی عزیزوں کو الگ کر کے ساری بات بیانی تو وہ سب کہے کہے رہ گئے اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

مولانا اپنی جگہ سے اٹھے اور اسلام کمال اور اس کے قربی عزیزوں کے پاس جا کر کہنے لگئے:

”اللہ پاک نے آپ پر خصوصی کرم کیا اور آپ کی بچی کی عزت کو ان کافروں کے ہاتھوں سے بچالیا۔ آپ تاریک غار میں گرنے سے نجع گئے۔ ختم

نبوت کے ڈاکو اب مسلمان بچیوں کی عزتوں پر بھی ڈاکہ ڈالنے لگے ہیں۔ ناموس رسالت کے لیے اب سور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی بیٹیوں کی ناموس کو بھی لوٹنے کی جسارتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو میری طرف سے کروڑا مبارک ہو کہ خدا نے آپ کی بچی کو ان بھیزوں سے بچالیا۔

اسلم کمال کا غم دھیرانی اب شدید غصہ میں بدل چکا تھا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کے کان میں کچھ کما کہ جاؤ اور پولیس کو ٹیلی فون کرو۔ یہ خوفناک خبر اسلام کمال کے عزیزو اقارب، دوستوں اور محلہ داروں میں بھی پھیل گئی۔ وہ سب غصہ سے دیوانے ہو رہے تھے۔ قریب تھا کہ وہ ان لیثروں کی مکاボٹی کر دیتے لیکن محلے کی چند بزرگ شخصیات درمیان میں حائل ہو گئیں اور انہوں نے بڑی مشکل سے انہیں سنبھالا اور انہیں کما کہ ابھی پولیس آ رہی ہے۔ آپ قانون ہاتھ میں نہ لیں۔ ابھی یہ کھینچتا تھی ہو رہی تھی کہ پولیس پہنچ گئی۔ اسلام کمال نے پولیس کو دیکھتے ہی دولہا اور اس کے والد کی جانب اشارہ کیا۔ پولیس کے جوانوں نے باپ بیٹے کو پکڑ کر گاڑی میں پھینکا اور تھانے لے گئے۔ چند منٹوں بعد تھانہ سینکڑوں لوگوں سے بھرا پڑا تھا اور وہ قادریانیوں کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ پولیس نے 298-C کے تحت پرچہ درج کیا اور باپ بیٹے کو حوالات میں بند کر دیا۔ مسلمانوں کا مشتعل ہجوم حوالات توڑ کر مجرموں کی "چھڑوں" کرنا چاہتا تھا لیکن جب تھانیدار نے بار بار تسلی دیتے ہوئے کما کر "بھائی ہم بھی مسلمان ہیں، ہم بھی بھن بیٹیوں والے ہیں۔ انشاء اللہ ان بیٹیوں سے کسی قسم کی رعایت نہیں کی جائے گی تو پھر ہجوم کے مشتعل جذبات مٹھنڈے ہوئے۔

اسلم کمال نے حکم دیا کہ کھانے کی ساری دلکشیں یتیم خانہ پہنچا دی جائیں۔ وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر بار بار مولا نانا محمد اکرم طوفانی کے ہاتھ چوم رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹکر کے آنسو روں تھے۔ یہ آنسو اس کی آنکھوں کے چشمیں سے نکل کر رخساروں سے بنتے ہوئے زمین پر گر کر اس مالک کے حضور بجدے کر رہے تھے؛ جس نے قاریانی قزاوں سے اس کی بیٹی کی عزت کی حفاظت کی تھی۔

www.sirat-e-mustaqeem.com



حَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

www.sirat-e-mustaqueem.com

بدنام زمانہ قادریانی مبلغ اللہ دلتہ جالندھری کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اس قصبہ میں بھیجا گیا تھا۔ قصبہ میں پہنچتے ہی اس نے حماموں کی دکانوں، ہوٹلوں، آڑ مت گاہوں و دیگر پلک مقامات پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ جہاں چار آدمی اکٹھے دیکھتا، قادریانیت کی بحث شروع کر دیتا۔ کسی قادریانی لڑکے کو بھیج کر سکول و کالج کے طلباء میں قادریانی لزپچ تقسیم کر دیتا۔ لوگ اس کی تحریکی کارروائیوں سے بہت نگک تھے۔ اکادمیک مسلمان انس کی بحث میں دلچسپی بھی لینے لگے۔ وہ جگہ جگہ مسلمانوں سے مناظرے بھی کرتا پھر تا جس سے یہ تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں اس علاقے میں ارتداونہ پھیل جائے۔ قصبہ کے چند حساس لوگوں نے ایک مینگ میں فیصلہ کیا کہ اس قادریانی مبلغ سے ایک فیصلہ کن مناظرہ کے لیے مناظر اسلام مولانا محمد علی جالندھری کو بلاایا جائے، جس میں قادریانیت اور قادریانی مبلغ کو ایک عبرت ناک اور رسوا کن نکست دی جائے تاکہ اس علاقے کے مسلمان قادریانیت اور قادریانی مبلغ جتنی لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

چنانچہ دو آدمیوں کا دند فوری طور پر مولانا محمد علی جالندھری کو لینے کے لیے ماہان بھیج دیا گیا۔ دو دن بعد مناظر اسلام مولانا محمد علی جالندھری قصبہ میں تشریف لا چکے تھے۔ اگلے دن نماز عصر کے بعد مناظرے کا اعلان ہو گیا۔ قصبہ کے کھیل کے میدان میں ایک سینچ لگادیا گیا۔ مناظرے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے قصبے اور اردو گرد کے رہمات میں پھیل چکی تھی اور لوگ جو ق در جوق مناظرہ سنئے کے لیے آرہے تھے۔ عصر کی نماز مولانا محمد علی جالندھری کی امامت میں میدان ہی میں اوایکی گئی۔ نماز کے فوراً بعد اللہ دلتہ جالندھری بھی قادریانیوں کی معیت میں مناظرہ کے لیے آپنچا۔

مولانا محمد علی جالندھری نے قادریانی کتابوں کا صندوق، جسے وہ ماہان سے اپنے ساتھ لائے تھے، منگوا کر سینچ پر رکھ لیا۔ مناظرہ شروع ہوا۔ پاسبان ختم نبوت مولانا محمد علی جالندھری نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ لچھے دار اور چیخ وار گفتگو نہ خود کوں گا اور نہ اپنے حریف کو کرنے دوں گا۔ سید ہی سادی اور دنوں کی گفتگو ہو گی۔ انہوں نے اللہ دلتہ جالندھری کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر تم میرے چند سوالوں کا جواب دے دو گے تو میں تمہارے موقف کا قائل ہو جاؤں گا۔ انہوں نے پہلا سوال کرتے ہوئے کہا کہ نبی کا نام ہمیشہ مفرد ہوتا ہے،

جیسے آدم، نوح، یعقوب، شعیب، یوسف، دانیال، ابراہیم، اسماعیل، احراق، موسیٰ، ہارون، عیسیٰ، محمد۔۔۔ لیکن مرزا قادریانی کا نام ”غلام احمد قادریانی“ یعنی مرکب کیوں ہے؟ اللہ دوست جالندھری آئیں باہمیں شامیں کرنے لگا لیکن حاضرین نے اس کی کسی دلیل کو صحیح نہ مانا اور وہ زیج ہو کر نیچے بینہ گیا۔

مولانا محمد علی جالندھری نے اپنا دوسرا سوال کرتے ہوئے کہا کہ کسی نبی کا دنیا میں کوئی استاد نہیں ہوتا۔ نبی کا استاد خود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے، جو اس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا ہے، جبکہ مرزا قادریانی کے بہت سے استاد تھے، جن سے وہ سبق لیتا رہا اور کبھی کبھی سابق یادوں ہوئے پر مرتباً بھی بتا رہا اور استاد کے ہاتھوں سے اسی لی پڑا، بھی ہوتی رہی۔ انہوں نے کہا کہ نبی دنیا والوں کو علم سمجھانے کے لیے آتا ہے، دنیا والوں سے نعم سمجھنے کے لیے نہیں آتا۔ ہر نبی اپنے وقت میں علم کے سب سے اوپرے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ انہوں نے اللہ دوست جالندھری کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ اگر تاریخ انبیاء میں کسی نبی کا کوئی استاد ہو تو ہتاڈ، ورنہ ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہارے مرزا کے استاد کیوں تھے؟

اس سوال پر اللہ دوست جالندھری صرف بغایں جھانک کر رہا گیا اور لوگوں نے اس پر کذاب کذاب کے آوازے کے۔

مولانا محمد علی جالندھری نے تیسرا سوال کرتے ہوئے کہا کہ ہر نبی اپنے وقت میں سب سے حسین ہوتا تھا۔ دنیا کا کوئی انسان حسن و جمال میں نبی کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اللہ دوست جالندھری نے فوراً اس بات کی تائید کی، جس پر مولانا محمد علی جالندھری نے اپنے صندوق سے مرزا قادریانی کی درجنوں تصویریں نکال کر حاضرین میں تقسیم کر دیں اور حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ رہی مرزا قادریانی کی تصویر اور پھر اپنی گرجدار آواز میں کہا کہ میں دعوے سے کھتا ہوں کہ اس مجمع کا ہر انسان مرزا قادریانی سے خوبصورت ہے، جس پر لوگوں نے بھرپور تائید سے جواب دیا ”بے شک“ بے شک۔

پھر مولانا نے اپنا روئے خن اللہ دوست جالندھری کی طرف پھیرتے ہوئے کہا ”اللہ دوست! اللہ کو حاضر ناظر جان کر بتا کہ کیا تو اس سے خوبصورت نہیں اور یقیناً تو خوبصورت ہے، تو پھر یہ تیغ انہی کیسے؟“

اللہ دوست جالندھری پر اوس پڑگنی اور وہ سردی میں شہرے سانپ کی طرح پھر بن گیا۔ مولانا نے چوتھا سوال کرتے ہوئے اللہ دوست جالندھری سے کہا ” بتاؤ مرزا قادریانی کی ذات

کیا تھی؟"

اللہ دوست جالندھری نے جھٹ جواب دیا "مغل"۔

مولانا اپنے شکار کو اپنے پھندے میں پھانس چکے تھے۔ انہوں نے فوراً قادریانی کتابوں سے عوام کو حوالہ جات دکھانے شروع کیے۔ انہوں نے کماکہ دیکھتے مرزا قادریانی اپنی کتاب

"کتاب البریہ" کے صفحہ ۱۳۲ پر اپنی قومیت بولا (مغل) لکھی ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ ۱۳۵ کے حاشیہ پر لکھتا ہے:

"میرے الہامات کی رو سے ہمارے آباء اولین فارسی تھے"۔

اپنی کتاب "ایک غلطی کا ازالہ" کے صفحہ ۱۲ پر لکھتا ہے:

"میں اسرائیلی بھی ہوں اور فاطمی بھی"۔

اپنی تصنیف "تحفہ گولزادیہ" کے صفحہ ۳۰ پر لکھتا ہے:

"میرے بزرگ چینی حدود سے چباج آئے تھے"۔

اپنی کتاب "نزول مسیح" کے صفحہ ۵۰ پر لکھتا ہے:

"بنی فاطمہ سے ہوں۔ میری بعض داویاں مشہور اور صحیح النسب سادات میں سے

تھیں"۔

پھر ہندو ہونے کا اعلان کرتا ہے:

"کرشن میں بھی ہوں"۔ ("تذکرہ" ص ۳۸۱)

پھر سکھ ہونے کا اعلان کرتا ہے:

"امین الملک جے سنگھ بہادر"۔ ("تذکرہ" ص ۳۷۲)

پھر انہوں نے عوام سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ کیا آپ نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جس کی اتنی ذاتیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جو شخص اپنی ذات کے بارے میں اتنے جھوٹ بول سکتا ہے وہ اپنی خصیت کے بارے میں کتنا جھوٹ بولتا ہو گا اور اتنے جھوٹ نے شخص کو نبوت کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی کوئی شرم نہ آتی ہوگی۔ مولانا کے تابودتوڑ حملوں سے اللہ دوست سنت پر ساکت و جامد بیٹھا تھا، جیسے اس کے منہ میں زبان نہ ہو، جیسے اس میں بولنے کی سکت نہ ہو۔ مولانا محمد علی جالندھری نے اپنا پانچواں سوال کرتے ہوئے کہا:

"بنی شریف انسان ہوتا ہے۔ وہ شرم و حیا اور شرافت کا پیکر ہوتا ہے۔ اس کی گنتگو انسانی کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ چراغ بن کر معاشرے میں

ایمان کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ اس کے منہ سے لگکر ہوئے جنم باد خوشبو بن کر دنیا کو معطر کرتے ہیں۔ کسی نبی کے منہ سے بے ہودہ اور لچر انگلکو کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کائنات کا نظام زیر وزبر ہو سکتا ہے، لیکن کسی نبی کے منہ سے گالی نہیں نکل سکتی۔ مولانا نے اللہ درتے سے پوچھا، "کیوں بھی یہ صحیح ہے؟"

اس نے اثبات میں سرہلا یا۔

پھر مولانا نے حاضرین مناظرہ کو مخاطب کر کے کہا کہ مرزا قادیانی کے منہ سے ساری زندگی گالیوں کی برسات لگی رہی۔ اس نے وہ گالیاں بھی ہیں کہ ابھی تک انسانیت دم بخود ہے، یا اس پر پیٹ رہی ہے، شرافت منہ چھپائے بیٹھی ہے اور اخلاق کا دامن تار تار ہے۔ پھر مولانا نے عقاب کی پھرتی سے صندوق میں ہاتھ ڈالا اور مرزا قادیانی کی بستی کتابیں نکال کر شیخ پر رکھ لیں اور عوام کو مرزا قادیانی کی گالیوں کے حوالے سانے شروع کیے۔ مجمع سے بار بار "لعنت لعنت" کی صدابلند ہوتی۔ مولانا نے قادیانی کتب سے جو حوالے پیش کیے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

"جھونٹے آدمی کی یہ نشانی ہے کہ جاہلوں کے رو برو تو بہت لاف و گزاف مارتے ہیں مگر جب کوئی دامن پکڑ کر پوچھے کہ ذرا ثبوت دے کر جاؤ تو جہاں سے نکلے تھے، وہیں داخل ہو جاتے ہیں"۔ ("حیات احمد" جلد اول، نمبر ۳، ص ۲۵)

"آریوں کا پرمیشور (خدا) ناف سے دس انگلی نیچے ہے۔ سمجھنے والے سمجھ لیں"۔ ("چشمہ معرفت" ص ۱۶)

"خدا تعالیٰ نے اس کی بیوی کے رحم پر مر لگا دی"۔ ("تمہ حقيقة الوجی" ص ۱۳)

"سعد اللہ لدھیانوی بے وقوفون کا نطفہ اور کنجی کا بینا ہے"۔ ("تمہ حقيقة الوجی" ص ۱۴)

"ہر مسلمان مجھے قبول کرتا ہے اور میرے دعوے پر ایمان لاتا ہے مگر زنا کار کنجیوں کو اولاد، جن کے دلوں پر خدا نے مر لگا دی ہے، وہ مجھے قبول نہیں کرتے"۔ ("آئینہ کمالات اسلام" ص ۷۷، ۵۳)

"عبد الحق کو پوچھنا چاہیے کہ اس کا وہ مقابلہ کی برکت کا لڑکا کہا گیا۔ کیا اندر ہی اندر پریٹ میں تخلیل پا گیا یا پھر جمعت قمری کر کے نطفہ بن گیا۔ اب

تک اس کی عورت کے پیٹ سے ایک چوبی بھی پیدا نہ ہوا۔ ”(”ضمیمہ انجام آنکھم“ ص ۲۷)

پھر مولانا نے اللہ دہ کی طرف پلتئے ہوئے اس سے جواب مانگا تو وہ لبؤں پر مر سکوت لگائے بیٹھا تھا۔ مولانا کے چیم حملوں نے اس سے قوت گویاً چھین لی تھی، اس کے سر سے دماغ نوج لیا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہاں پر اللہ دہ نہیں، اللہ دہ کا بابت پڑا ہو۔۔۔۔۔ اس کی مکمل خاموشی اس کی مخلست کا اعلان کر رہی تھی۔ چند سینڈ کے توقف کے بعد فضانِ رہبری۔۔۔۔۔ اللہ اکبر سے گونج اٹھی۔
عوامِ نلک شگاف نفرے لگا رہے تھے۔

نُرَةٌ بُكْبِيرٌ ————— اللہ اکبر

تَاجِدَارُ خَتْمِ نَبُوتٍ ————— زندہ باد

تَلْجَ وَ تَحْتَ خَتْمِ نَبُوتٍ ————— زندہ باد

شَهِيدَانُ خَتْمِ نَبُوتٍ ————— زندہ باد

مُجَاهِدَيْنُ خَتْمِ نَبُوتٍ ————— زندہ باد

مُولَانَا مُحَمَّدُ عَلِيٌّ جَالِندَھْرِي ————— زندہ باد

حق جیت گیا، باطل ہار کیا۔ مجاہدین ختم نبوت سرفراز ہوئے، کفر سرگاؤں ہوا۔ اسلام کا بول بالا ہوا، قادریانیت کا منہ کلا ہوا۔ مسلمانوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے اور وجود و کیف میں مسلمانوں نے وہ نعروباڑی کی کہ سارا قصہ گونج اٹھا۔ ادھر قادریانی اللہ دہ جالندھری کو لیے یوں چلے جا رہے تھے جیسے اللہ دہ کا جنازہ لیے جا رہے ہوں۔

فاتح قادریانیت مولانا محمد علی جالندھری جب اگلے دن قصہ سے ملماں رو انہ ہونے لگے تو وہ انتہائی عقیدت و محبت سے مولانا کو شیشن تک چھوڑنے کے لیے آئے اور مولانا کو رخصت کرتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو امڑ آئے۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور مولانا گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جب مولانا گاڑی میں سوار ہو رہے تھے تو اچانک ان کی نظرِ اللہ دہ پر پڑی، جو اس گاڑی میں ان سے اگلے ڈبے میں سوار ہو رہا تھا۔ گاڑی اپنی منزل کی جانب رو انہ ہو گئی۔ شیشن پر کھڑے ادگوں نے پر نم آنکھوں کے ساتھ اپنے ہمسن کو الوداع کہا۔

تقرباً میں منٹ کی مسافت کے بعد جب گاڑی اگلے شیشن پر رکی تو مولانا اپنے ڈبے سے اترے اور اگلے ڈبے میں اللہ دہ کے پاس چلے گئے اور اس کے ساتھ غالی نشت پر بینہ

گئے۔ اللہ دیتہ چونک اخْنَاء۔ مولانا نے اس سے کہا کہ گھبرا نے کی کوئی بات نہیں، میں تم سے ایک انتہائی ضروری بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس وقت ہماری گفتگو تیرے میرے سوا کوئی نہیں سن رہا۔

اللہ دیتہ! تم ایک پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی ہو۔ خدا کو حاضرنا طریقہ جان کر اور جہنم کی آگ کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ کر بتانا کیا مرزا قادیانی اللہ کا بنی تھا؟“ مولانا نے پوچھا۔

اللہ دیتہ: ”نہیں۔“

مولانا: ”کیا وہ مسیح موعود تھا؟“

اللہ دیتہ: ”نہیں۔“

مولانا: ”کیا وہ امام مہدی تھا؟“

اللہ دیتہ: ”نہیں۔“

مولانا: ”کیا اس پر وحی اترتی تھی؟“

اللہ دیتہ: ”نہیں۔ (ہنس کر)

مولانا: ”کیا اس کی یوں ام المومنین اور کیا اس کے ساتھی صحابہ تھے؟“

اللہ دیتہ: ”نہیں۔“

مولانا: ”کیا بہشتی مقبرے کا بہشت سے کوئی تعلق ہے؟“

اللہ دیتہ: ”نہیں۔“

مولانا: ”کیا موجودہ قادیانی خلافت کا اسلام سے کوئی تعلق ہے؟“

اللہ دیتہ: ”نہیں۔“

مولانا: ”تو پھر تم کیوں قادیانیت کے پیروکار ہو اور کیوں اللہ کی مخلوق کو گمراہ کر رہے ہو؟“

اللہ دیتہ: ”مولانا، مجھے اس کام کے پانچ ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں۔۔۔ آپ مجھے دس ہزار دے دیں، میں آپ کی طرف آ جاتا ہوں“ اللہ دیتہ نے ایک زوردار شیطانی قیصر لگاتے ہوئے کہا۔۔۔ اور مولانا محمد علی جالندھری اگلست بدندہ اس رہ گئے۔





Alleged

الْمُسْكَنُ الْمُسْتَقِيمُ لِلْمُسْلِمِينَ

نمود و نمائش نے ہمارے معاشرے کو ایک سرطان میں مبتلا کر رکھا ہے۔ فیشن نے ایک کرام مچار کھا ہے۔ پیسہ ہمارے معاشرے کا سنگھار بن چکا ہے اور ہر طرف پیسے کا طواف ہو رہا ہے۔ مقابلہ بازی نے لوگوں کا سکون غارت کر رکھا ہے۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ میرے گھر کی دیوار دوسرے کے گھر سے اوپھی ہو۔ ہر کوئی خواہش رکھتا ہے کہ سوسائٹی میں ہر مقام پر اس کی ناک دوسرے کی ناک سے اوپھی ہو۔ جسمی عزتیں بنانے کے لیے کیا کیا جتنی کیے جاتے ہیں۔ حلal و حرام کی تمیز اٹھ گئی ہے اور اس تمیز کے اٹھنے سے ایک طوفان بد تیزی اٹھ کھڑا ہوا ہے، جس نے پورے معاشرے کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ رسم و رواج کے پھنڈوں سے ہمارے دم گھٹ رہتے ہیں۔ متوسط طبقہ چھلی کے پاؤں کے درمیان پس رہا ہے اور بڑی تکالیف سے حیات مستعار کے دن کاٹ رہا ہے۔

معین باری بھی ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایف۔ اے بیک تعلیم پائی تھی، لیکن چار سال نوکریوں کے پچھے بھاگنے کے باوجود اسے نوکری نہ ملی۔ جب چار سال نوکریوں کے لیے درخواستیں لکھ کر اس کے ہاتھ تھک گئے تو اس نے محلہ میں میاری کی دکان کھول لی اور زندگی کی گازی کو دھکا لگانے لگا۔ عرصہ آٹھ سال وہ دکان کرتا رہا، لیکن بڑی مشکل سے گھر کا گزارہ چلتا۔ اس دوران وہ چار بیٹیوں اور ایک بیٹی کا باپ بن چکا تھا۔

ایک دن اس کی بیوی نے اس سے کہا کہ معین! ابھی توجہ انہی ہے اور بچے چھوٹے ہیں۔ تم پانچ سال باہر لگا آؤ اور محنت مشقت سے ایک معقول رقم اکٹھی کرلو اور پھر پاکستان لوٹ کر کوئی اچھا سا کار و بار سیٹ کر لینا۔ اس سے ہم بچیوں کی شادیوں سے بھی بسکدوش ہو جائیں گے۔ معین باری بیوی کی ناصحانہ گفتگو سن کر فکر کے سندر میں غوطہ زن ہو گیا اور ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بیوی سے کہنے لگا کہ بات تو تمہاری نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے خود کو ذہنی طور پر باہر جانے کے لیے تیار کر لیا۔ پھر اس دن کا سورج طلوع ہو گیا، جب معین باری اپنے بیوی بچوں کو پچھوڑ کر جماز میں بینہادوہنی جا رہا تھا۔ دوہنی اسے اس کے ایک دوست نے بایا تھا اور اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں اس کی مازمت کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

پاکستان میں تو وہ دن میں ایک دن نمازیں پڑھ لیا کرتا تھا، لیکن پرنسپل میں پہنچ کر خدا ازیادہ یاد آنے لگا اور اس نے باقاعدگی سے پہنچ وقت کی نماز پڑھنا شروع کر دی، جس سے اس کے قلب کو سکون اور اطمینان حاصل ہوا۔ باجماعت نمازوں نے اس کے ایمان کو جلا بخشی اور اس کے دل میں تربہ اور تفسیر کے ساتھ قرآن پاک پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے سوچا کہ مطالعہ کے لیے کس تفسیر کا انتخاب کیا جائے۔ وہ وہاں پر مقیم ایک پاکستانی عالم دین کے پاس گیا اور ان کے سامنے اپنا سوال پیش کیا۔ انہوں نے اسے مولانا شبیر احمد عثمانی کی تفسیر "تفسیر عثمانی" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ وہ مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام نامی سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کو شیخ الاسلام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ عالم اسلام کے نامور عالم دین فخر المحدثین مولانا سید انور شاہ شمیری کے شاگرد ارجمند تھے۔ بالآخر پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے ان کے مبارک ہاتھوں سے پاکستان کا جھنڈا البرایا تھا اور مولانا موصوف نے ہی قائد اعظم کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ اس لیے وہ اسی شام بازار پہنچا اور "تفسیر عثمانی" خرید لایا۔ وہ روزانہ ڈیڑھ ٹکھنے تلاوت، ترجمہ اور تفسیر کے مطالعہ میں منہک رہتا۔ دوران مطالعہ میں باری بعض جگہوں پر رک جاتا، بعض جگہوں پر محکم جاتا اور بعض جگہوں پر چونک جاتا۔ ان عبارتوں کو مانندے پر اس کا دل کسی صورت تیار نہ ہوتا۔ وہ قابل اعتراض ساری عبارتوں پر نشان لگاتا جاتا اور دل میں عمدہ کرتا جاتا کہ مولانا صاحب "جنہوں نے اس تفسیر کا انتخاب کیا تھا، ان سے ان اعتراضات کے بارے میں پوچھوں گا۔ تقریباً دو میں کے مطالعہ سے اس کے پاس بہت زیادہ قابل اعتراض باتیں آئندی ہو گئیں۔ وہ عبارتیں آجھے اس قسم کی تھیں:

- نعلیٰ اور بروزی نبوت کا عقیدہ۔
- مرزا قادریانی کی نبوت۔
- عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینا۔
- آقاۓ دو عالم، خاتم النبیین: نبی محمد علی سلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے بعد بھی نبوت کا جاری رہنا۔
- مرزا قادریانی۔۔۔ آنے والا مسیح موعود۔
- مرزا قادریانی بحیثیت امام مددی۔

○ مرزا قادیانی کے مجرمات کا تذکرہ۔

○ مرزا قادیانی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا۔

ایک دن معین باری 'ساری نشان زدہ عبارتیں لے کر اس عالم دین کے پاس حاضر ہوا اور انہیں ایک ایک عبارت دکھائی۔ عالم دین "تفیر عثمانی" میں یہ عمارتیں دیکھ کر جیران و ششدروں رہ گئے۔ وہ اپنا ماہما کپڑ کریوں سوچنے بیٹھ گئے جیسے کسی مراقبہ میں غرق ہوں۔ پھر انہوں نے ایک لمبا سانس چھوڑتے ہوئے کہا کہ یہ "تفیر عثمانی" نہیں ہے، لیکن معین باری انہیں بار بار تفسیر دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ جناب یہ دیکھیں، اس کی جلد پر جملی حروف سے "تفیر عثمانی" اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام لکھا ہوا ہے۔

مولانا صاحب وہیں سے معین باری کو ساتھ لے کر ایک دوسرے عالم دین کے گھر گئے، جن کا تعلق عالمی مجلس تحفظ ثتم نبوت سے تھا اور ان کے پاس قادیانیت اور رد قادیانیت کی ایک وسیع لا تبریری تھی۔ دونوں نے ساری صورت حالات ان عالم دین کے سامنے رکھی۔ وہ فوراً ایک ماہر بناض کی طرح سارے معاملے کو سمجھ گئے۔ وہ اٹھے اور سامنے والی الماری سے مرزا قادیانی کے بیٹھے مرزا بشیر الدین کی تفسیر "تفیر صغیر" انجھالائے، جس کفریہ اور ارتدادی تفسیر میں بری طرح اسلامی عقاید کی قطع و برید کی گئی ہے۔ مولانا صاحب نے قادیانی تفسیر، تفسیر صغیر اور تفسیر عثمانی کے صفحات ملائے تو دونوں جگہ ایک ہی طرح کی عبارتیں تھیں۔ مختلف جگہوں سے صفحات ملائے گئے لیکن کسی جگہ بھی انہیں بیس کا بھی فرق نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا صاحب سارا معاملہ سمجھے چکے تھے۔ وہ کہنے لگے:

"قادیانی، تفسیر صغیر پر تفسیر عثمانی کی جلد چڑھا کر اسے تفسیر عثمانی کے نام پر فردخت کر رہے ہیں"۔

وہ تمیوں وہاں سے اٹھے اور ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کے پاس پہنچے اور اسے یہ خوفناک ارتدادی حرم سے آگاہ کیا۔ پولیس آفیسر نے کہا کہ میرے پاس پہنچے بھی ایک دو مرتبہ اس قسم کی شکایتیں آئی تھیں، لیکن میں نے اس وقت مصروفیت کی وجہ سے اس پر کوئی خاص توجہ نہ کی۔ لیکن اب آپ کے تشریف لانے سے میں اس عجین جرم کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ ہوا ہوں اور میں مجرموں تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری تو انا یاں اور صلاحیتیں وقف کر دوں گا۔ پولیس آفیسر نے شرکی ساری پولیس کو مجرموں کے بارے میں ارش کر دیا۔ دو دن کے

بعد معین باری دو علمائے کرام کے ساتھ پھر پولیس آفیسر کے پاس پہنچا اور اس سے اس مسئلہ کے بارے میں پیش رفت پوچھی تو پولیس آفیسر نے انہیں بتایا کہ ہم مجرموں کے بالکل قریب ہنچ کچے ہیں، عنقریب آپ ان کی گرفتاری کی خوشخبری سنیں گے۔ ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ یہ قادیانی تفسیر لندن سے ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر دہن آ رہی ہے اور یہاں تفسیر عثمانی کے نام سے بک رہی ہے اور قادیانی ایک خوفناک مم کے تحت اس تفسیر کو مسلمانوں میں پھیلا رہے ہیں۔

اگلی صبح جب معین باری نے گھر کی دہنی پر اتنا زہ اخبار اخھایا تو اس میں بہت بڑی سرخی کے ساتھ یہ خبر درج تھی:

”قادیانی تفسیر صغير“ جسے ایک منصوبے کے تحت تفسیر عثمانی کے نام سے پھیلا یا جا رہا تھا، ایک قادیانی کے گھر سے اس کی ہزاروں جلدیں برآمد کر لی گئی ہیں اور پولیس نے دو قادیانی مجرموں کو گرفتار کر لیا ہے اور دیگر مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔“

معین باری یہ خبر پڑھ کر خوشی سے پھولانہ سما تھا کہ اس کی نشاندہی اور توجہ دلانے سے کتنی بڑی سازش پکڑی گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں یہاں یہوی بچوں کے مالی تحفظ کے لیے آیا تھا، لیکن اللہ پاک نے مجھ سے تحفظ ختم نبوت کا کتنا بڑا کام لے لیا۔ میں اپنے اہل و عیال کی معاشی حفاظت کے لیے یہاں آیا تھا، لیکن خداۓ رحمان نے مجھ سے حفاظت قرآن کی خدمت لے لی۔ میں یہاں اپنا مستقبل سنوارنے آیا تھا، لیکن مالک رحیم نے میری آخرت سنوارنے کا کام بھی کر دیا۔



www.sirat-e-mustaqeem.com



بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



ایس سال تھا یا ان لہجہ ان کی کہانی جو کافی نیت
کے جنم سے فرار ہو کر گلشنِ اسلام کا مکین ہو گئی

عَالَمُ كَوْنَطْسُونْتُرْنُوبُوتْ
تِنْكَانْهُ صَادِبْ مَلَائِعْ شِيشْ وَ بُورَةْ

”میں صبح سے شام تک تانگہ چلاتا ہوں لیکن گھر کی دال روٹی پھر بھی نہیں چلتی۔ گھوڑے کے چارے اور دانے کا خرچہ بھی خاصا ہے۔ مختلف ضروریات کے وقت تھوڑی تھوڑی رقم جو لوگوں سے ادھار لیتی ہے، اب وہ دس ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ میں بڑی مشکل سے فہیم الدین کو آٹھویں جماعت تک پڑھا سکا ہوں۔ اب غربت میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں اور میری ہمت جواب دے سکتی ہے، لہذا اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ فہیم الدین کو سکول سے انھالیا جائے۔“

کرم الہی کو چوہان نے انتہائی رنجیدہ خاطر ہو کر اپنی بیوی حنیفہ سے کہا۔ خادوند کی یہ پریشان کن باتیں سن کر حنیفہ نے ٹھنڈی آہ بھری جیسے غربت کو تلنگنے کی کوشش کر رہی ہو۔ حنیفہ ایک تابعدار بیوی کی طرح اٹھی اور دن بھر کے تھنکے ہارے خادوند کو بڑی محبت سے روٹی گرم کر کے دی اور کہا کہ کھانا کھائیے۔ جان ہے تو ان دکھوں کا مقابلہ کر رہی لیں گے۔ کھانے کے دوران میاں بیوی میں گستاخ کا دور بھی چلتا رہا۔ حنیفہ ایک بہادر اور مدد بر عورت تھی۔ اس نے خادوند کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”سرتاج! آپ فہیم الدین کی تعلیم کی کوئی فکر نہ کریں۔ اللہ نے مجھے صحت دے رکھی ہے۔ میں لوگوں کے گھروں میں بر تن مانجھ لیا کروں گی اور اس آمدی سے فہیم الدین کی تعلیم کا سلسلہ چلتا رہے گا۔“

کرم الہی کو چوہان مارے غصے کے کاپنے لگا اور غیرت سے اس کے نتھنے پھول گئے جن سے سانس شوں شوں کر کے نکلنے لگی۔ اس نے غصے میں کاپنے ہوئے اپنی بیوی سے کہا ”یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تم میری زندگی میں لوگوں کے گھروں میں نوکری کرو۔ یہ میری غیرت کا خون ہو گا۔“

حنیفہ نے ایک ماہروں کی طرح دلائل دیتے ہوئے کہا ”محنت میں کیا عمار ہے۔ میں کاسہ گداکی لے کر کسی کے گھر مانگنے تو نہیں جاؤں گی، کام کا ج ہی تو کرنے جاؤں گی۔ بیٹے کو تعلیم کی راہ سے ہذا لینے سے یہ محنت مشقت کی راہ بہتر ہے۔“

آخر حنیفہ نے خادوند کو اپنے موقف کے حق میں قائل کر لیا۔ فہیم الدین و اتنا اپنے نام کی تعبیر تھا۔ وہ ہمیشہ کلاس میں اول آتا۔ اساتذہ اس سے بڑی

محبت کرتے۔ آخر وہ وقت آگیا جب فہیم الدین نے میزک کے امتحان میں پورے سرگودھا بورڈ میں تیسرا پوزیشن حاصل کی۔ ماں باپ خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے۔ محلے کے سینکڑوں لوگ آج مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر میں جمع تھے۔ کرم الہی کوچوان نے پورے محلے میں ہتھیے تقسیم کیے۔ فہیم الدین کو محکمہ تعلیم سے وظیفہ ملنا شروع ہو گیا اور وہ اپنی تعلیم کا خرچہ خود اٹھانے کے قابل ہو گیا۔

فہیم الدین نے اُن آئی کالج روہ میں ایف۔ ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ ایف۔ ایس سی کے امتحان میں وہ پورے ضلع میں اول آیا۔ اسے ایف۔ ایس سی میں بھی محکمہ تعلیم کی طرف سے وظیفہ ملا۔ اب فہیم الدین اپنی ماں کے سامنے سخت چنان کی طرح ڈٹ گیا اور اس نے ماں کے مشقت والے ہاتھ مفبوطی سے پکڑ کر کہا۔

”ماں! اب میں تجھے لوگوں کے گھروں میں کام کاج کے لیے نہیں جانے دوں گا۔ اب میں جوان ہو چکا ہوں۔ مجھے اپنی مزید پڑھائی کے لیے حکومت کی طرف سے وظیفہ بھی ملے گا اور میں ٹیکش پڑھا کر ابا جان کا ہاتھ بھی بٹاؤں گا۔ پیاری ماں! تجھے میری محبت کی قسم، اب تو لوگوں کے گھروں میں نہیں جائے گی۔“

ماں نے لاذلے بیٹیے کے سامنے ہتھیار پھینک دیے۔ فہیم الدین کو انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں داخلہ مل گیا۔ وہاں سے اس نے انجینئرنگ کی ڈگری امتیازی حیثیت سے حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اسے ایک پرائیویٹ فرم میں پانچ ہزار ماہانہ کی نوکری مل گئی۔ اس کی اعلیٰ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے فرم نے چھ ماہ بعد اسے انگلستان بھیج دیا۔ وہاں سے اس نے لاکھوں روپے کا کردار الدین کو بھیجی۔ کرم الہی کوچوان کے گھر سے غربت رخصت ہو گئی اور پیسے کی ریل پیل نے گھر میں ایک چمک پیدا کر دی۔ کرم الہی کوچوان نے تانگہ بھیج دیا اور وہ گھر میں فرست کے لمحات گزارنے لگا۔ پھر فہیم الدین کی ایک امیر قادریانی گھر میں شادی کر دی گئی کیونکہ فہیم الدین کے والدین بھی قادریانی تھے۔ اپنے قواعد کے مطابق ایک قادریانی مبلغ نے روہ میں اس کا نکاح پڑھایا۔ دو سال میں فہیم الدین کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ وہ انگلستان میں انتہائی خوشحالی کی زندگی گزار رہا تھا لیکن دفتر میں اسے اس تکلیف کا شدت سے احساس تھا کہ مسلمان ملازمین اس کے قادریانی ہونے کی وجہ سے اس سے کچھ کھنچ رہتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ کھانا لھانے سے پرہیز کرتے تھے۔ کئی تو اس سے سلام بھی نہ لیتے تھے۔ اسے اپنی

شادی غمی کے پروگراموں میں بھی فیض بلاتے تھے۔ یوں فہیم الدین مسلمانوں سے کٹا کٹا سا رہتا تھا۔

ایک دن اس کا ایک انجینئر دوست ہدایت خان اس کے پاس آیا اور کہنے لگا
”فہیم الدین! آج لندن کے ویمبلی ہال میں ختم نبوت کا انفرنس ہے، جس میں دنیا بھر سے علمائے کرام تشریف لارہے ہیں۔ میں آپ کو کا انفرنس میں شمولیت کی دعوت دیتا ہوں۔
جانے اور سننے میں کیا حاجج ہے۔“

پہلے تو فہیم الدین کچھ پہچاپا لیکن پھر اس نے جانے کی ہائی بھرلی۔ کیونکہ ہدایت خان نے اسے دعوت ہی اس موڑ اور دل نشین انداز میں دی تھی کہ اس کے پاس دعوت کو روکنے کے الفاظ ہی نہ تھے۔ دونوں دوست مقررہ تاریخ پر بدقائق ویمبلی ہال میں پہنچ گئے اور اُنکی نشتوں پر انہیں جگہ مل گئی۔ تلاوت کلام پاک سے کا انفرنس کا آغاز ہوا۔ خوش الحان قاری نے سورۃ الاحزانہ، جس میں خاتم النبیین محمد علی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کا ذکر بڑی صراحة سے ہے، کی آیات مبارکہ کی تلاوت اس سوز سے کی کہ حاضرین پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ تلاوت قرآن کے بعد نعمت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش کی گئی، جس میں نعمت خواں صاحب نے عقیدہ ختم نبوت پر منظوم انداز میں خوب روشنی ڈالی۔ پھر تقریروں کا نورانی سلسلہ شروع ہوا۔ مقررین آتے رہے اور عقیدہ ختم نبوت اور رود قادریانیت کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔ آخر میں ایک وجہہ اور منور چہرہ والے بزرگ مقرر تشریف لائے۔ انہوں نے حاضرین سے خطاب فرماتے ہوئے کہا

”میں آج صرف قادریانیوں کو دعوت اسلام کے موضوع پر تقریر کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ جہاں ہم قادریانیوں کے خلاف جماد کرتے ہیں، وہاں ہمیں راتوں کو بیدار ہو کر اللہ کے سامنے اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر ان کی ہدایت کے لیے پرسوز دعائیں بھی ماگئی چاہئیں۔ ہم عالمگیر نبی کے عالمگیر امتی ہیں۔ ہمیں ہر انسان کو جنم میں جانے سے بچانا چاہیے۔ یہ ہمارا فرض منصبی ہے کیونکہ ختم نبوت کے بعد اس کائنات میں کسی نئے نبی نے تو دنیا میں آنا نہیں، لہذا دعوت و تبلیغ کی ساری زمداداری امت محمدیہ پر ڈال دی گئی ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جہاں وہ عقیدہ ختم نبوت کی حفاظت کرے، وہاں وہ قادریانیوں کی قادریانیت کے شیطانی پنجے سے رہائی کی بھی بھرپور کوشش کرے۔“

انہوں نے قاریانیوں سے کہا "اے قاریانیو! تم دنیا کے ہر معاملہ میں خوب غور و فکر کرتے ہو۔ سوچ اور فکر کے گھوڑے دوڑاتے رہو۔ ایک روپے کا منی کا پالہ خریدنا ہو تو خوب ٹھوک بجا کر دیکھتے ہو۔ جو تا خریدنا ہو تو سارے بازار کا چکر لگاتے ہو۔ سبزی خریدنی ہو تو سونگھ سونگھ کر دیکھتے اور دیکھ کر سونگھتے ہو۔ پنجے کے لیے سکول و کالج کا انتخاب کرنا ہو تو ہر ہملوسے جائزہ لیتے ہو۔ بینی یا بینی کا رشتہ دیکھنا ہو تو شجرہ نسب کھنگال ڈالتے ہو۔ لیکن مرزا قاریانی کو نبی مانتا ہو تو بالکل نہیں سوچتے۔ کوئی دلیل طلب نہیں کرتے۔ کبھی غور و فکر کے مراقبے میں نہیں بیٹھتے"۔

انہوں نے کہا "عقیدہ وہ چیز ہے جس پر تمہاری اگلی لامتاہی زندگی کا دارود مدار ہے۔ عقیدہ ٹھیک ہو گا اور اگر اعمال کم بھی ہوں گے تو نجات ہو جائے گی۔ لیکن اگر عقیدہ غلط ہو گا اور اعمال ہمایہ پھاڑ جتنے بھی ہوں گے تو نجات نہیں ہو گی۔ تمہارے پاس موت کی آخری بھگی تک کے لیے مہلت باقی ہے۔ اس مہلت کو اللہ تعالیٰ کی مہلت جلیلہ سمجھو۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ اس مہلت کے بعد پھر کوئی مہلت نہیں ہو گی"۔

پھر جب انہوں نے جنم اور اس کی سزاویں کا نقشہ کھینچا تو پورا اہل کپکا اٹھا۔ اس بزرگ عالم کی تقریر نے فہیم الدین کے دل و دماغ میں ایک طوفان پا کر دیا۔ وہ گھر آیا تو اس کے دماغ میں اس عالم کے الفاظ گوئختے لگے۔ اسے راتوں کو بڑی بڑی دیر تک نیندہ آتی۔ وہ بستر دراز خلا میں گھورتا رہتا۔ اتفاق سے پندرہ دن بعد اسے ایک ماہ کی رخصت پر پاکستان جانا تھا۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ پاکستان چلا گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد باپ 'ماں اور بیٹا' تینوں بیٹھتے تھے کہ فہیم الدین اپنے والدین سے کہنے لگا "آج مجھے آپ سے ایک انتہائی اہم میٹنگ کرنی ہے"۔ پھر وہ انتہائی تجسس کے ساتھ اپنے باپ سے پوچھتا ہے۔

"ابا جان! آپ قاریانی کیسے ہوئے؟"

باپ جواب میں کرتا ہے "ہم بھارت کے شر جالندھر کے رہنے والے تھے۔ تقیم وطن کے بعد جڑاںوالہ کے ایک گاؤں میں آگئے۔ سکونوں نے ہمارا سب کچھ لوٹ لیا۔ خالی ہاتھ یہاں پہنچے۔ میں نے اور تمہاری والدہ نے سرک کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنائی اور اس میں رہنے لگے۔ میں دن کے وقت محنت مزدوری کی تلاش میں کل جاتا۔ اگر کہیں کوئی کام مل جاتا تو رات کو کھانے کو کچھ مل جاتا اور نہ بھوکے ہی سو جاتے۔ ایک دن میں اسی

پریشانی میں جھونپڑی سے باہر بیٹھا تھا کہ ایک سیاہ رنگ کی کار جھونپڑی کے قریب آکر رکی۔ اس سے ایک ادھیر عرف شخص باہر لکلا۔ مجھے بڑی محبت سے ملا۔ میرا حال پوچھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ آدمی نہیں بلکہ اللہ نے رحمت کا کوئی فرشتہ بیج دیا ہو۔ میں نے اسے اپنی ساری پتلتا سنائی۔ دو دن کے بعد وہ آدمی پھر آیا اور ہمیں روہ لے گیا۔ وہاں ہمیں ایک چھوٹا سا مکان رہنے کے لئے دے دیا گیا۔ پھر اس آدمی نے مجھے ادھار میں ایک تانگہ خرید کر دیا۔ میں روے میں تانگہ چلانے لگا اور ہر ماہ تانگہ کی ادھاری ہوئی رقم کا کچھ حصہ ادا کرنے لگا۔ میں نے پانچ سال میں ساری رقم ادا کر دی۔ اسی دوران میں اس کارروائی شخص کے کہنے پر قادریانی ہو گیا۔

” قادریانی ہوتے وقت آپ نے کچھ سوچا نہیں؟ ” فہیم الدین نے پوچھا۔

” میں نے سوچا جس شخص کا اخلاق اتنا اچھا ہے، اس کا دھرم بھی اچھا ہی ہو گا ” اس کے والد نے جواب دیا۔

”ابا جی! آپ نے تبدیلی مذہب کرتے ہوئے کوئی سوچ بچارہ کی؟ ”

” بیٹا! میں ان پڑھ آدمی تھا۔ اس شخص کے مالی تعاون سے ممنون ہو کر قادریانی ہو گیا۔ ”

” امی جان! کیسے قادریانی ہوئیں؟ ”

” بیٹا! جب میں قادریانی ہو گیا تو یہ بھی ہو گئی۔ اس بیچاری کو کیا پڑتا؟ ”

” اب ابی! اب قادریانیت کے بارے میں آپ کی معلومات۔ ”

” بیٹا! میں بالکل نہیں جانتا۔ صبح تانگہ لے کر جاتا اور شام کو تھکا ہارا وہاں آتا۔ آتے ہی کھانا کھاتا اور سو جاتا۔ یہی میری زندگی تھی۔ مجھے مذہب کا کیا پڑتا؟ یہی حال تمہاری امی کا ہے۔ ”

فہیم الدین نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

” اب ابی! ایمان وہ نعمت ہے جس پر دنیا کی ساری لعنتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ آپ نے صرف مکان اور تانگے کے عوض مذہب تبدیل کر لیا۔ آپ نے صرف ایک شخص کا مشقانہ سلوک دیکھ کر مرزا قادریانی کو نہیں مان لیا۔ اگر وہ شخص قادریانی کی بجائے عیسائی ہوتا تو آج ہم سب عیسائی ہوتے۔ اگر وہ شخص پارسی ہوتا تو آج ہم پارسی ہوتے۔ اگر وہ شخص ہندو ہوتا تو آج ہم بھی ہندو ہوتے۔ یہ تو تبدیلی مذہب کا کوئی جواز نہیں۔ ”

اب فہیم الدین منزل حقیقت تک پہنچنے کے لیے یوں بے چین تھا جیسے ریگستان میں کوئی بھولا بھٹکا پا سامان فرپانی کی تلاش میں ہو۔ وہ لا ہور پہنچا اور اپنے ایک مسلمان دوست کے توسط سے ایک نامور عالم دین کے پاس حاضر ہوا اور اپنے ٹکوک و شبہات ان کے سامنے رکھے اور ان سے رہنمائی کی درخواست کی۔ وہ عالم دین اسے بڑی محبت سے ملے۔ بڑے پتاک سے اپنے پاس بھایا اور اس کے ٹکوک و شبہات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”بیٹا نبوت کا روشن سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت ہم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ اس کائنات ارض دنیا میں سب سے پہلے نبی آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ قرآن پاک کی ایک سو سے زائد آیات اور دو سو دس سے زائد احادیث عقیدہ ختم نبوت پر دلالت کرتے ہوئے موجود ہیں۔“ پھر انہوں نے قرآن دحدیث کی چند آیات اسے سنائیں۔

انہوں نے کہا ”مرزا قادریانی نے انگریزوں کی ایک بھائیں سازش کو کامیاب کرنے کے لیے نبوت کا ذرا رامہ رچایا۔ پھر انہوں نے مرزا قادریانی کی کتابوں سے وہ خوالہ جات پیش کیے جس میں مرزا قادریانی نے خود لکھا ہے کہ میں انگریز کا خود کاشتہ پودا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ مرزا قادریانی نے ظلی و بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ کائنات میں کوئی بھی ظلی و بروزی نبی نہیں آیا۔ پھر انہوں نے مرزا قادریانی کی کتابوں سے وہ حوالے دکھائے جس میں مرزا قادریانی نے اپنی نبوت کا انکار کیا ہے اور مدعا نبوت کو کافر قرار دیا ہے۔ مرزا قادریانی کی پیشگوئیوں کے بارے میں بتایا جو گن گن کر جھوٹ ہابت ہوئیں۔ وہ گالیاں سنائیں جو مرزا قادریانی نے ملت اسلامیہ کو دی ہیں۔ مرزا قادریانی کے شراب پینے اور افیون کھانے کے حوالہ جات دکھائے۔ اللہ رسول اللہ کتاب اللہ کے بارے میں مرزا قادریانی کی ہرزہ سرائی اور آخر میں اسے مرزا قادریانی کی تصویر دکھائی اور بتایا کہ نبی اپنے وقت میں دنیا کا خوبصورت ترین انسان ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تصویر دیکھئے کہ یہ کتنا کریمہ سورت ہے۔ کیا نبی اس محل کے ہوتے ہیں؟“

فہیم الدین کے اندر سے قادریانیت کا بُت نُوث پھوٹ چکا تھا۔ اس کے دل و دماغ قادریانیت کے خلاف بغاوت پا کر چکے تھے۔ اچانک اس نے ایک جھر جھری سی لی اور اس نے بزرگ عالم دین کے پاؤں پکڑ لیے اور ان سے استدعا کی کہ میں قادریانیت سے تائب ہونے کا

اعلان کرتا ہوں۔ مجھے ابھی مسلمان سمجھئے اور اس نے بزرگ عالم دین کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لیا۔ وہ اسی رات ریوہ پہنچا، والدین اور بیوی بچوں کو اکٹھا کیا اور انہیں اپنے مسلمان ہونے کی ساری رواداد سنائی۔ اس کے بعد اس نے انہیں بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، جسے ان سب نے قبول کر لیا۔ فہیم الدین اگلے دن ان سب کو لے کر لاہور آیا اور انہیں بھی اس بزرگ عالم دین کے ہاتھوں پر اسلام قبول کرایا۔ ریوہ میں ان کے اسلام قبول کرنے کی ہلکی ہلکی خبر پھیل چکی تھی اور فہیم الدین قادریانیوں کے انتخابی حربوں سے بھی آگاہ تھا۔ لہذا اس نے اپنے والدین اور بیوی بچوں کو لاہور چھوڑا اور خود رات کے وقت ٹرک لے کر ریوہ پہنچا۔ گھر کا سارا اسامان ٹرک میں رکھا اور رات ہی کو چکے چکے ریوہ سے نکل آیا۔

جب وہ ریوہ سے بھاگ رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ جھملتی ہوئی دھوپ سے ٹھنڈی چھاؤں کی طرف جا رہا ہو۔ جیسے لیروں کی بستی سے وادی امن کی طرف جا رہا ہو۔ جیسے جنم سے فرار ہو کر سوئے جنت جا رہا ہو۔



www.sirat-e-mustaqueem.com



چوہدری اللہ بخش اپنے گاؤں کا نبڑوار تھا۔ پانچ مرلخ زمین کا مالک تھا۔ خدا تعالیٰ نے پانچ ہی بیٹوں سے نوازا تھا۔ ذات کا راجھوت تھا۔ اس کی زندگی بڑے خاشق سے گزر رہی تھی۔ پورے گاؤں میں اس کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ ہنچاہت میں اس کے فیضے کو آخری فیصلہ مانا جاتا تھا۔ ایک دن چوہدری اللہ بخش اپنی بڑی بیٹی سے ملنے ضلع جہنڈ کے قصبه اٹھارہ ہزاری گیا۔ جب ہفتہ بھر والوں نہ آیا تو گھروالوں کو سخت تشویش ہوئی۔ بڑا بیٹا باپ کا پتہ کرنے بن کے گھر پہنچا اور حیرت کے مارے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، جب اس کی بیٹی نے اسے بتایا کہ ابا جان تو ہمارے گھر آئے ہی نہیں۔ چوہدری کی بیٹی کا غم کے مارے برا حال ہو گیا۔ وہ روتی دھوئی فوراً بھائی کے ساتھ مار کے گھر آگئی۔ چوہدری کا گھر غم کدھہ ہنا ہوا تھا۔ بچے رو رہے تھے۔ بیوی پر سکتہ طاری تھا۔ چوہدری کے گم ہونے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی اور سارا گاؤں چوہدری کے گھر دوڑ آیا۔ گاؤں کے بزرگ چوہدری کی گمشدگی پر مختلف خدشات کا اظہار کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اسے کسی نے قتل نہ کر دیا ہو لیکن دوسرا اس کی اس سوچ کو یہ کہہ کر ختم کر دتا کہ چوہدری کی تو کسی سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ کوئی کہتا کہ کہیں اسے اغوا برائے توان نہ کر لیا گیا ہو، لیکن دوسرا اس کی اس بات کو یہ کہہ کر رد کر دتا کہ اگر کسی نے اغوا برائے توان کیا ہوتا تو وہ فوراً اہل خانہ سے رقم کا مطالبہ کرتا۔ گاؤں کے لوگوں کو اس بات کا سب سے شدید خدشہ تھا کہ وہ کہیں حدیث کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ اس لئے گاؤں کے ایک بزرگ نے آئندہ نوجوانوں کی ڈیویٹیاں لگائیں کہ وہ مختلف شروں کے ہمتالوں اور تھانوں سے رابطہ کریں۔ گاؤں کے نوجوان حاصل کردہ ہدایات لے کر مختلف شروں کے ہمتالوں اور تھانوں میں پھرتے رہے لیکن چوہدری اللہ بخش کا کوئی سراغ نہ ملا۔

چوہدری کو گم ہوئے ایک مینہ گزر چکا تھا۔ ایک روشن صبح گاؤں کے لوگ اپنے کھیتوں میں کام میں گئے تھے۔ عورتیں مردوں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ بھینیں گاؤں کے تالاب میں نماری تھیں۔ سکول جانے والے بچے اپنے بنتے گلے میں لٹکائے

سکول کی جانب روائی دوائی تھے کہ گاؤں کے کچھ بچے بھاگے شور چاتے چوہدری کے گرد داخل ہوئے۔ وہ اپنی اونچی آواز میں کہہ رہے تھے۔
”چوہدری آگیا ہے، چوہدری آگیا ہے۔“

یہ خوش کن آواز کالوں میں پڑتے ہی چوہدری کے یوں بچے باہر کی جانب بھاگ اٹھے اور اچانک وہ کیا دیکھتے ہیں کہ واقعٹا چوہدری چلا آ رہا ہے۔ مارے خوش کے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ چوہدری کے ساتھ ایک سفید داڑھی والا بزرگ شخص بھی چلا آ رہا ہے۔ سب بچے دوڑے اور باپ سے لپٹ گئے۔ سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے جو بے تمثاشا ہے جا رہے تھے۔ چوہدری کی آمد کی خبر پورے گاؤں میں جھلک کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ اپنے کام کاچ دیں پر چھوڑ کر چوہدری کو دیکھنے کے لیے بھاگے۔ سب حیرت اور خوشی کے طے جلنے جذبات سے چوہدری کو دیکھتے اور بغل گیر ہو جاتے۔ لوگ چوہدری کے ساتھ آئے بزرگ کو دیکھ کر حیراں ہوتے، جس کی عمر سو سال کے لگ بھگ تھی لیکن صحت بہت اچھی اور اعصاب مضبوط تھے اور پہلی نظر دیکھتے ہی وہ بزرگ کوئی ہوشیار آدمی محسوس ہوتا تھا۔ گرد والوں نے چوہدری سے پوچھا، ”ہمارا تو رو رو کر برا حال ہو گیا تم اتنے دن کماں رہے ہو؟۔۔۔۔۔ یہ بزرگ کون ہے؟ چوہدری نے کہا کہ یہ بزرگ میرے محسن ہیں اور میں کماں رہا، اس کی تفصیل کل مجمع عام میں سناؤں گا۔

اگلے دن چوہدری نے پورے گاؤں کی دعوت کی، دیگریں پکائیں۔ چوہدری کی حوالی کا تقریباً تین کنال کا صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کرسی پر چوہدری بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ والی ایک بڑی سی کرسی پر وہ بزرگ بیٹھا تھا۔ چوہدری نے سب لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کماں گیا تھا اور میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ اس نے کہا:

”میں اپنی بیٹی سے ملنے بس میں سوار اخبارہ ہزاری جا رہا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ بس میں میری ساتھ والی لشت پر یہ بزرگ تشریف فرا تھے۔ ان کا میرے ساتھ بیٹھنا میری فیروز بختی کا باعث بن گیا۔ انہوں نے میرے مقدر کو بدل دیا۔ انہوں نے مجھے جنم سے بچا لیا۔ دوران سفر انہوں

نے مجھے بتایا کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور ان کی قبر کشمیر میں ہے۔ احادیث نبوی میں جس صحیح موعود کے نزول کا تایا گیا ہے، وہ صحیح موعود مرزا غلام احمد قادریانی ہے، جس کا ظہور قادریان میں ہوا۔ اور وہی امام مددی ہیں۔ انہوں نے مجھے بصیرت فرماتے ہوئے کہا کہ اگر تم اپنے ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو اس صحیح موعود اور امام مددی کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔ یہ مجھے ساتھ لے کر ربوہ چلے گئے اور میں نے صحیح موعود کے خلیفہ کے ہاتھ پر بیت کر لی اور پھر مجھے تعلیم و تربیت کے لئے ایک مسینہ ربوہ میں روک لیا گیا تاکہ مرزا غلام احمد قادریانی کی تعلیمات میرے ذہن میں راستہ ہو جائیں۔ ایک مسینہ میں میری تعلیم و تربیت کا بھرپور اہتمام کیا گیا۔ دوستو! یہ بزرگ میرے حسن ہیں۔ میں ساری زندگی ان کے احسانات کا پدھر نہیں دے سکتا۔ اگر یہ مجھے نہ ملتے تو میری آخرت برباد ہو جاتی اور میں جنم کا ایندھن بن جاتا۔

میں نے آج یہ محفل اس لیے سجائی ہے اور ان بزرگوں کو اس ضعیف العمری میں تکلیف دے کر اس لیے ساتھ لایا ہوں کہ مجھے تمہاری آخرت کی بھی فکر ہے۔ آخر تم سب میرے دوست اور عزیز و اقارب ہو، لہذا میں دل کی احتہاگ گراہیوں سے تم سے التماس کرتا ہوں کہ تم مرزا قادریانی کی مسیحیت، مہذب اور نبوت پر ایمان لے آؤ۔ اگر کوئی علی شہادت ہوں تو جوابات کے لئے یہ بزرگ حاضر ہیں، جنہوں نے انہیں آنکھوں سے مرزا صاحب کی زیارت کی ہے اور ان کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک حصہ گزارا ہے اور یہ ان کی نبوت کے عینی شاہد ہیں۔“

گاؤں کے لوگ اگرچہ غریب تھے اور چوبدری کے کئی احسانوں کے زیر بار بھی، لیکن چوبدری کی اس کفر و ارتداد پر مبنی تقریر نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ انہوں نے چوبدری پر بے شمار لغتیں بھیجنیں اور اس کے بزرگ پر بھی لعن طعن کی اور وہیں پر چوبدری کے سو شل ہائیکاٹ کا اعلان کیا۔ گاؤں کے علماء نے چوبدری کو مرتد قرار دے دیا۔ چوبدری کے بیوی بچوں نے اس سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور نئے

گھر سے نکال دیا۔ اس کے دوستوں نے اس سے یارانے تو ہے۔ وہ لوگ جو چودہ ری کو کبھی اپنی پلکوں پر بخاتے تھے، اب اس سے بات کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ چودہ ری گھر پار چھوڑ کر اپنے مریعوں پر چلا گیا اور وہاں ایک مکان بنایا کہ قادریانی بزرگ کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ صبح شام قادریانی بزرگ کی خدمت میں مست رہتا۔ اس کی ٹانگیں دباتا، اس کی ماش کرتا، اس کے کپڑے انتہائی عقیدت سے اپنے ہاتھوں سے دھوتا، اس کے جو تے پالش کرتا، اس کے لئے بازار سے بہترن سے بہترن فروٹ لاتا، اس کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے پکاتا جو شاید کسی رئیس کے دستِ خوان پر بھی موجود نہ ہوتے ہوں۔ قادریانی بزرگ بھی کھانوں کو یوں صاف کرتا جیسے بکری چوکر کو صاف کرتی ہے۔

ایک دن چودہ ری نے قادریانی بزرگ کے لئے چار مختلف کھانے پکائے اور کھانا پکائے کا حق ادا کر دیا اور قادریانی بزرگ نے کھانے کا حق ادا کر دیا۔ قادریانی بزرگ پیٹ کا منکا منہ تک بھرنے کے بعد چارپائی پر لمبا ہو گیا۔ آدمی رات کو اس پر ہیٹھے نے حملہ کر دیا اور اچاک اتنے پاخانے اور الٹیاں آئیں کہ وہ صبح سے پہلے عزرا نیل کا فکار ہو گیا۔ چودہ ری اس کی موت پر آئٹھ آئٹھ آنسو رویا۔ اس نے اس کی لاش پر یوں میں کیے جیسے اس کے پانچ بیٹے اکٹھے فوت ہو گئے ہوں۔ اس نے اس کی فلاحتیں اپنے ہاتھوں سے صاف کیں، اسے نملا یا اور دو گھوڑا مار کے بوکلی کا کفن پہنایا اور اپنے ہاتھوں سے قبر کھود کر اسے گاؤں کے قبرستان میں رات کو دفن کر دیا۔ صبح اٹھتے ہی چودہ ری شر چلا گیا اور دو من تازہ گلاب کے پھول لے آیا اور سارے پھول قادریانی بزرگ کی قبر پر سجا دیے۔ قبر دیکھنے میں یوں محسوس ہوتی جیسے پھولوں کا پہاڑ ہو۔ اس کے بعد چودہ ری نے ان پھولوں پر بہترن خوبیوں چھڑکیں جن سے سارا قبرستان مٹک اٹھا۔ گاؤں کے چند چھواہے جب اپنی بھیڑ بکھلان چراتے ہوئے قبرستان سے گزرے تو چودہ ری نے انہیں دیکھ کر ان سے کہا، ”دیکھو یہ قبرِ مرتضیا صاحب کے ”صحابی“ کی قبر ہے۔ دیکھو یہ کتنی حیثیں اور ولشیں ہے۔ دیکھو اس سے کتنی خوبیوں کے تالے اٹھ رہے ہیں۔ یہ قبر اور پر سے جتنی خوبصورت ہے، اندر سے بھی اتنی ہی خوبصورت ہے۔ جس طرح اس قبر کے اوپر سے خوبیوں کی ہوائیں اٹھ

رہی ہیں، اسی طرح یہ قبر اندر سے بھی مک رہی ہے۔ مجھے تو یہ قبر دیکھ کر جنت کی یاد آ رہی ہے۔ بھتی جنت کی یاد کیوں نہ آئے اس میں ایک جنتی جو سو رہا ہے۔ آؤ جس نے دنیا میں جنت دیکھنی ہے اس کی قبر کو دیکھ لو۔۔۔ اور جو جنت میں جانا چاہتا ہے اس صاحب قبر سے تعلق پیدا کر لے۔۔۔

چہواہوں نے یہ باتیں آ کر گاؤں کے چوپال پر سنا دیں اور پھر یہ خبر پورے گاؤں میں گوم گئی۔ رات کو گاؤں کے بیوں کا اجلاس ہوا اور انسوں نے اس صورت حال پر خوب فور کیا۔ انسوں نے ڈپنی کمشز کو درخواست دی کہ مذہبی نقطہ نظر سے کوئی فیر مسلم مسلمانوں کے قبرستان میں اپنا مردہ و فن نہیں کر سکتا۔ ہمارے گاؤں کے قبرستان میں ایک قادریانی مرتد کو دفن کر دیا گیا ہے۔ برائے مہماں اس کو فوری طور پر قبرستان سے نکلا جائے۔ ڈپنی کمشز نے درخواست منظور کرتے ہوئے فوری طور پر قادریانی مردے کو مسلمانوں کے قبرستان سے نکالنے کا حکم جاری کر دیا۔ بڑی تعداد میں گاڑیوں میں سوار پولیس گاؤں کے قبرستان میں پہنچ گئی۔ انتظامیہ کے اعلیٰ افسر بھی ساتھ تھے۔ پورا گاؤں اور اردو گرد کے دہماتوں سے ہزاروں مسلمان قبرستان میں پہنچ ہوئے تھے۔ چوبہری بھی لاش وصول کرنے کے لیے وہیں کمرا تھا۔ وہ سخت غصہ میں تھا لیکن کچھ کرنہ سکتا تھا۔ اس نے غصہ میں گاؤں کے لوگوں سے کہا:

”دیکھنا ابھی میرے پیر و مرشد اور مرزا غلام احمد قادریانی کے ”صحابی“ کی قبر کھلے گی اور قبر سے ایسی خوشبو تیں لٹکیں گی کہ فضائیں معطر ہو جائیں گی۔ خوشبو سے لدی ہوائیں ماحول پر ایک مستقی طاری کر دیں گی۔ بد بختو! جنت تو تمہارے مقدر میں نہیں، آج دنیا میں جنت کی محنتی ہواں کو محسوس کرلو۔ جنمیو! تمہاری آنکھوں کو تو بہشت بریں دیکھنا نہیں آج دنیا میں ہی جنت کا گلزار دیکھ لو۔۔۔“

موقعہ پر موجود تھانیدار نے چوبہری کو خاموش کرایا اور اس نے چار چوہڑوں کو حکم دیا کہ قبر کو کھوں دو۔ قبر کھلنے کا منظر دیکھنے کے لیے لوگ قبر پر دوانہ وار گر رہے تھے۔ سینکڑوں لوگ اردو گرد کے درختوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ چوہڑوں نے قبر سے مٹی ہٹائی۔ سامنے اب قبر پر پھر کی سلیں پڑی تھیں۔ جب قبر سے پہلی سلی بھائی

گئی تو پھک کر کے بدو کا ایک ایسا ہمچوکا لکھا کہ لوگوں کے رامغ پہنچنے لگے۔ شدت بدو سے لوگوں کی آنکھوں سے پانی نکل آیا۔ درجنوں لوگ قتے کرنے لگے۔ لوگ قبر سے دور دوڑنے لگے۔ ہر طرف سے توبہ کی صدا اٹھنے لگی۔ کئی لوگ خوف خدا سے روئے لگے۔ کمزور دل لوگ قبرستان سے بھاگنے لگے۔ چوہدری کا بھی بدو سے برا حال تھا۔ وہ بار بار قتے کر رہا تھا۔ بدو کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے پانی نکل کر اس کے رخساروں پر بہ رہا تھا اور شدت بدو سے بچنے کے لیے اس نے اپنی ناک کو رومال سے زور سے پکڑ رکھا تھا۔ بدو اور تفنن اتنا شدید تھا کہ چوہڑوں نے لاش نکالنے سے انکار کر دیا، لیکن جب ڈی سی صاحب نے ہر چوہڑے کو پانچ پانچ سورپہیہ انعام دینے کا وعدہ کیا تو چوہڑے راضی ہو گئے۔ انہوں نے جب باقی سلیں ہٹائیں تو قبر سے بدو کے ایسے ہولناک طوفان اٹھ رہے تھے کہ گاؤں کی عورتیں اپنے گھروں میں اس بدو سے بے حال ہو رہی تھیں۔ چوہدری ابھی تک ڈھیٹ بنا قبر کے کنارے کھڑا تھا۔ چوہدری نے جب قبر میں جھانک کر دیکھا تو پوری قبر انتہائی خونتاک کیڑوں سے بھری پڑی تھی، جو بخلی کی سرعت سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ جب چوہڑوں نے دیکھا کہ کیڑے نصف لاش ہضم کرچکے تھے۔ کیڑے لاش کی ناک سے داخل ہو کر منہ سے باہر نکل رہے تھے۔ کیڑوں نے ساری لاش میں اس طرح سوراخ کر رکھے تھے جیسے کسی ماہر کارگیر نے ڈرل مشین سے سوراخ کیے ہوں۔ آدمی سے زیادہ زبان کھائی جا چکی تھی۔ پورے ہونٹ کیڑوں کی غذا بن چکے تھے اور نسواری دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ جسم اس طرح کالا ہو چکا تھا جیسے گرم ملاخوں سے داغا گیا ہو۔ پوری لاش سے انتہائی بدو دار پانی پھر رہا تھا۔ چوہڑوں نے لاش کو قبر سے نکالنے کے بعد ایک بڑی سی بوری میں بند کر دیا اور پھر تھانیدار نے چوہدری کو مخاطب کر کے کہا:

”چوہدری! یہ پڑی تمہاری ملکیت! اسے وصول کر لو اور جلد از جلد

اسے اپنی زمین میں دفن کرلو کیونکہ بیماریاں پھیلنے کا سخت خطرہ ہے۔“

چوہدری ساکت و جامد کھڑا تھا۔۔۔۔۔ گویا چوہدری نہیں کوئی بت کھڑا

ہے۔۔۔۔۔ تھانیدار نے اسے دو مرتبہ ہلا کر بلایا لیکن وہ خاموش رہا۔۔۔۔۔ اور پھر جب

تحانیدار نے اسے زور سے ہلایا تو وہ دھرام سے زمین پر کر گیا۔۔۔ وہ سجدے کی
حالت میں تھا۔۔۔ وہ خدا سے جیچے جیچے کر معانی مانگ رہا تھا۔۔۔ اس کے پورے
جسم پر لرزہ طاری تھا۔۔۔ تحانیدار نے جب اسے اٹھایا تو وہ کہہ رہا تھا:

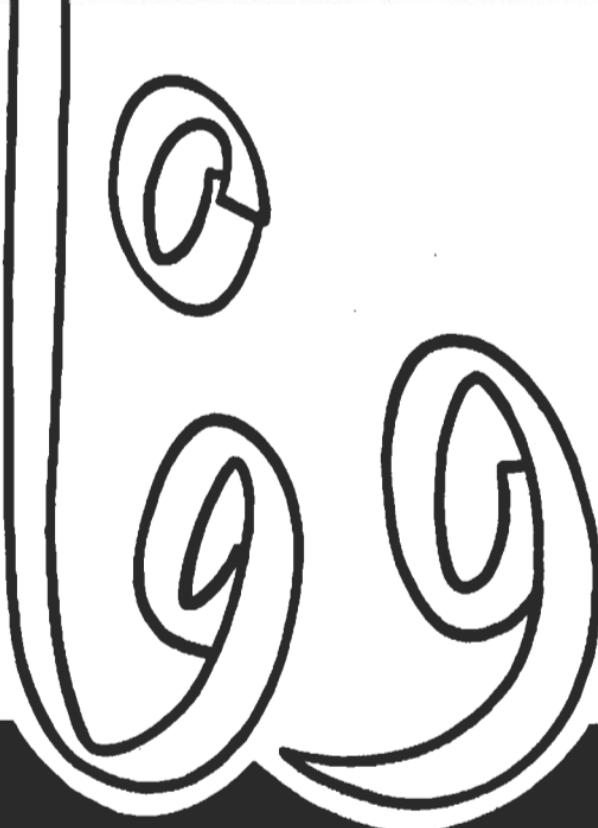
”میرے کرم مالک! تو باب سے زیادہ کرم ہے۔۔۔ تو مال سے زیادہ
رحم ہے۔۔۔ میں تیری رحمت پر صدقے واری۔۔۔ میں تیرے کرم پر
قربان۔۔۔ تو نے میری ہدایت کے لئے کتنا بڑا سامان کیا۔۔۔ اگر میں
اپنی بقیہ زندگی کی ساری ساعیں تیرے حضور سجدے میں گزار دوں تب
بھی تیرا حق ادا نہ ہوگا۔۔۔ میں نے تمھ سے بغاوت کی لیکن تو نے مجھ پر
رحمت کی۔۔۔ میں نے تمھ سے جفا کی لیکن تو نے مجھ سے وفا کی۔۔۔
میں نے تجھے چھوڑا لیکن تو نے اپنا دست کرم مجھ سے نہ کھینچا۔۔۔ میں
فاتح العقل قادریانیت کے جنم میں کو د گیا۔۔۔ لیکن تیری رحمت کے
ہاتھوں نے مجھے اٹھا کر دوبارہ گلشنِ اسلام میں پہنچا دیا۔۔۔“

پھر چہدری نے غصہناک آنکھوں سے لاش والی بوری کو دیکھا اور بوری کو پورتی
قوت سے ٹھڈا مارتے ہوئے کہا:

”مردود کیں کا۔۔۔“

اور پھر آتشیں لبھے میں تحانیدار سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا:
”میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ اسے ربہ لے جاؤ یا کتوں کے آگے ڈال

دو۔۔۔



عالمی مجلس حفظ ختم نبوت ننانہ صاحبِ ضلح شیخوپور

وہ دون بھر کا تھکا ماندہ رات کو گھر پہنچا تو سامنے کمرے میں لگے گھڑیاں نے بارہ وغیرہ نہ بجا کر اس کا استقبال کیا۔ وہ اپنے بیڈ رومن میں داخل ہوا۔ بستر پہنچتے ہی اس نے اپنا جسم بیند پر یوں گرا دیا جیسے کوئی تھکا ہارا مزدور منزل پ پہنچ کر سر سے بھاری گھڑی زمین پر پہنچنک دیتا ہے۔

اس میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ کپڑے بدل سکے۔ اس کا انگل انگل درد کر رہا تھا۔ اس نے کمرے کی لائٹ بھائی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے اور اعصاب کو سکون دینے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نیند کی آنکھ میں پہنچ چکا تھا۔ رات کے پچھلے پروہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ مرد کا ہے۔ اس کے والدین، بہن بھائی اور بچے اس کی چار پانی کے گرد گھیرا ڈالے تھے و پکار کر رہے ہیں۔ وہ ان کی دلدوڑ آوازیں سن رہا ہے، لیکن جواب نہیں دے سکتا۔ اس کا منہ کپڑے سے زور سے باندھ دیا جاتا ہے کہ لیکن منہ نیڑھا نہ ہو جائے اور اس کی دونوں ٹانکیں نہنوں کے قریب سے رہیں سے باندھ دی جاتی ہیں تاکہ ٹانکیں کھل نہ جائیں۔ وہ سنتا ہے کہ اس کے گھر کے نیلی فون سے اس کے عزیز و اقارب کو اس کی موت کی اطلاع دی جا رہی ہے۔ وہ یہ بھی سنتا ہے کہ اس کے بھائی شرمنیں رہنے والے عزیز و اقارب کو اس کی موت کی خبر سنانے جا رہے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ محلہ کی عورتیں گھر میں آنکھا ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ اچانک وہ مسجد کے لاوز پیکر سے آواز سنتا ہے کہ کوئی منادی اعلان کر رہا ہے:

”حضرات! ایک ضروری اعلان سننے، چوبہ ری افضل حسین قضاۓ اللہ سے انتقال کر گیا ہے۔ اس کا جنازہ نہیک چار بجے اس کے گھر سے انکھا یا جائے گا۔ تمام حضرات سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ جنازہ میں شرکت فرمائے کر ثواب دارین حاصل کریں۔“

وہ یہ خوفناک اعلان سن کر چیخنا چاہتا ہے لیکن قوت گویائی سلب ہو چکی ہے۔ وہ انہوں کر بھاگنا چاہتا ہے لیکن اعضا حکم مانتے سے بغاوت کر چکے ہیں۔ پھر اس نے سنا کہ اس کا چچا اپنے بیٹے سے کہہ رہا ہے کہ غسال اور کفن بننے والے درزی کا انتظام کرو۔ پھر اس کاماؤں اس کے چچا سے کہہ رہا تھا کہ پہلے محلے کے موادی صاحب سے ہے تو پوچھو لو کہ کفن کو کپڑا لتنا لگے گا۔ پھر اس کے ماموں نے اس کے چچا سے پوچھا کہ کیا قبر کا بند و بست ہو گیا ہے؟ اس کے

پچانے کماک قبر کا بندوبست تو میں صبح ہی کر آیا تھا اور اپنے سامنے ہی کھدائی شروع کرادی تھی۔

اسے پتہ چلتا ہے کہ باہر دریاں بچھ گئی ہیں۔ محلے دار دریوں پر بیٹھنا شروع ہو گئے ہیں۔ اندر وہ شر سے آنے والے عزیز واقارب بھی پہنچنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے سنائے ملکان سے اس کی بہن کا فون آیا ہے اور اس نے تاکید کیا ہے کہ میں فوراً آ رہی ہوں۔ میرے آنے سے پہلے میرے بھائی کا جنازہ نہ اٹھایا جائے۔

اچانک اس کے کانوں میں ایک خوفناک آواز پڑتی ہے:

”میت کو غسل کے لیے تیار کرو اور غسل کا سارا اسامان لے آؤ۔“ یہ غسال کی آواز تھی۔ غسال کے حکم پر چند نوجوان اس کی چارپائی اٹھا کر گھر کے صحن کے ایک کونے میں رکھ دیتے ہیں اور پردے کے لیے اردو گرد چادریں تان دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کا بھائی اس کی کلائی سے اس کی محبوب ”راڑو“ گھری اتارتا ہے، جو اس نے اپنے ایک دوست سے دوئی سے منگوائی تھی۔ پھر اس کے ہاتھوں سے سونے کی انگوٹھی اتاری جاتی ہے جو اس کی ساس نے اسے اس کی متفقی کے دن پہنائی تھی۔ اس کی جامہ تلاشی لی جاتی ہے اور اس کی جیب سے ہزاروں روپے اور کاغذات نکالے جاتے ہیں۔ وہ حضرت سے اس ڈرامہ کا نکٹ دیکھتا ہے، جس کی اس نے آج ہی ایڈ و انس بکنگ کرائی تھی اور کل دوستوں کے ساتھ الجمرا آرٹ سینٹر میں وہ ڈرامہ دیکھنا تھا۔ اس کی قیض اتار دی جاتی ہے۔ اس کی خوبصورت نسواری رنگ کی پینٹ جو اس نے آج ہی پہنی تھی اس کے جسم سے جدا کر دی جاتی ہے۔ اب اس کے جسم پر فقط ایک جلنگیہ رہ جاتا ہے۔ وہ غسال سے جیخ جیخ کر کھانا چاہتا ہے کہ خدارا! میرا جان گیہ نہ اتارتا، میں بالکل ننگا ہو جاؤں گا، لیکن اس کی زبان تو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ غسال کے بے رحم ہاتھ بڑھتے ہیں اور اس کا واحد تن پوش جلنگیہ بھی اتر جاتا ہے۔ اس نگ دھڑنگ کو اٹھا کر نہانے والے پہنچنے پر لٹا دیا جاتا ہے۔ پھر پانی اور بالائی کی آواز آتی ہے۔ اچانک ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا اس کے جسم پر گرتا ہے۔ وہ کانپنا چاہتا ہے لیکن کانپ نہیں سکتا۔ پھر دھڑا دھڑا اس پر پانی کے ڈو ڈو گرنے لگتے ہیں۔ پھر غسال اپنے سخت ہاتھوں سے اس کے جسم پر صابن ملنے لگتا ہے۔ اسے الناسیدھا کرتا ہے۔ کبھی کسی پہلو لٹاتا ہے اور کبھی کسی پہلو۔ نہلانے کے بعد اسے کفن پہنایا جاتا ہے۔ اس کے نہنوں میں روئی ٹھونس دی جاتی ہے، عطر کا چھڑکاڑ ہوتا ہے۔ کفن پر مشک بور بکھیر دیا جاتا ہے اور اسے اٹھا کر جنازے

دالی چارپائی پر لٹا دیا جاتا ہے اور چارپائی کو انھا کر گھر کے صحن میں رکھ دیا جاتا ہے۔ سینکڑوں مردوں زن اس کا چڑہ دیکھنے کے لیے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ چینوں کا ایک طوفان اٹھتا ہے، آنسوؤں کا ایک سیلا ب بہ جاتا ہے۔ اس کی بیوی اور بہنیں اس کے اوپر گرجاتی ہیں۔ اس کے والدین اور بچے رو رکڑھال ہو جاتے ہیں۔ اچانک مسجد سے پھر ایک اعلان ہوتا ہے: حضرات! افضل حسین کا جنازہ تیار ہے، جو احباب جنازے میں شامل ہونا چاہتے ہوں وہ مرحوم کے گھر فوراً پہنچ جائیں۔

چارپائی نوجوان جنازے کی چارپائی کو انھانے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ گھر کی عورتیں مزاحم ہوتی ہیں لیکن وہ کلمہ شادوت کی ایک زوردار صدائگا کر جنازے کی چارپائی انھا لیتے ہیں۔ اور ہر جنازہ اٹھتا ہے، ادھر چینوں کی خوفناک آندھی سے ماحول تھر تھر اٹھتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ جب جنازہ گھر سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ اس کی خنی سوزو کی گاڑی جو اس نے پہچلنے میں ہی خریدی تھی باہر گلی میں کھڑی ہے۔ بازار سے جب اس کا جنازہ گزر رہا تھا تو اسے محلے کی وہ دکانیں نظر آ رہی تھیں جہاں وہ پہنچنے میں گھر سے اچھل کو دکرتا سودا سلف لینے کے لیے آیا کرتا تھا۔ راستے میں اسے وہ کھیل کامید ان بھی نظر آیا جہاں وہ پہنچنے میں دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا اور فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ راہ میں اسے اپنا سکول نظر آیا جہاں ہر سال پاس ہونے پر اس کے والد صاحب اس کو پھولوں کے ہار پہنایا کرتے تھے۔ سفر کرتے کرتے جنازہ جنازہ گاہ میں پہنچ گیا۔ یہ جنازہ گاہ اس نے پہلے بھی کئی دفعہ دیکھی تھی، لیکن ہر دفعہ جنازہ کسی اور کا ہوتا تھا اور وہ نماز جنازہ پڑھنے کے لیے آتا تھا۔ لیکن آج جنازہ اس کا اپنا تھا اور دوسرے جنازہ پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ جنازہ زمین پر رکھ کر لوگ دضو کے لیے چلے گئے۔ جو نبی لوگ واپس آئے، فضا میں ایک گردبار آواز گوئی:

”تمام بھائی نماز جنازہ کی نیت سن لیں۔“ یہ نماز جنازہ پڑھانے والے مولوی صاحب کی آواز تھی۔

انہوں نے کہا:

”چار سمجھیر نماز جنازہ، فرض کفایہ، شاء و اسطے اللہ تعالیٰ کے، درود و اسطے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے، دعا و اسطے اس حاضر میت کے، منہ طرف قبلہ شریف کے، پہچھے اس امام کے۔“ اس کے بعد امام صاحب نے نماز جنازہ کا طریقہ بتایا۔ اس نے سوچا کیا ان لوگوں کو نماز جنازہ اور اس کی نیت نہیں آتی۔ لیکن جلد ہی اس کے ضمیر نے جواب دیا کہ تجھے بھی تو یہ

سب کچھ نہ آتا تھا۔ تو بھی تو لوگوں کے جنازے ایسے ہی پڑھا کرتا تھا۔ اس جواب سے اس کی خوب تسلی ہو گئی۔

نماز جنازہ شروع ہونے سے قبل جب صفیں تیار ہو چکی تھیں، اپاٹنک اس کے خمیدہ کر والد صاحب مجمع کے سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ اگر میرے مرحوم بیٹے نے کسی کا قرض دینا ہو تو وہ اپنا قرض مجھ سے لے سکتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ادھراس کے والد صاحب نے یہ اعلان کیا ادھراس کا دوستِ مشی خال جس سے اس نے پچاس ہزار روپے لینے تھے اور کئی وفعہ رقم طلب کرنے پر وہ اسے آج کل پر خدا دیتا تھا۔ صفوں سے باہر نکلا اور پوری آواز سے چلا کر سارے مجمع کو مخاطب کر کے کہنے لگا: ”میں نے افضل حسین سے پچاس ہزار روپے لینے تھے، لیکن میں اس کا دوست ہونے کے ناتے اسے معاف کرتا ہوں۔“

مشی خال کا یہ اعلان اس پر دوسری موت طاری کر گیا اور وہ سوچتا رہ گیا کہ شقی القلب دنیا موت کے ساتھ بھی نہیں مذاق سے نہیں چوکتی۔ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اور جنازہ سونےے قبرستان روانہ ہو جاتا ہے۔ قبر کے کنارے چارپائی رکھ دی جاتی ہے۔ لوگ قبر کے گزھ کو دیکھ کر اللہ اللہ کی صدائیں بلند کر رہے ہیں۔ جنازہ کی چارپائی کی ایک سائیڈ کو کھولا کیا۔ ایک باہم نوجوان آگے بڑھا اور اس نے اس کی کرمیں ایک مضبوط کپڑا ڈال کر اسے درمیان سے اٹھایا۔ دو نوجوانوں نے اس کے سر اور پاؤں پکڑے۔ کلمہ شہادت کا ایک زور دار ورد ہوا اور وہ لوگوں کے بازوؤں کے سارے زمین سے زیر زمین جا پکا تھا۔ قبر نے اسے اپنے پیٹ میں لٹالیا تھا۔ اس کا منہ قبلہ رخ کیا گیا۔ پھر اس نے اپنے محلے کے ایک بزرگ، جسے وہ چاہا کرم دین کے نام سے پکارا کرتا تھا، کی آواز سنی:

”بچو! وقت کم ہے، شام کے سائے بڑاہ رہتے ہیں۔ جلدی سے سلیں رکھو اور مشی

ڈالو۔“

یہ آواز سن کر اس کے جسم میں ایک زلزلہ آگیا۔ اس کا اہل دنیا کے ساتھ یہ آخری مصافی تھا۔ قبر پر سلیں رکھ دی گئیں۔ پھر یکدم لوگوں نے قبر پر مشی گرانی شروع کر دی۔ قبر میں ہولناک اندر ہیرا چھا گیا۔ وہ زمین کے باہر والے انسانوں کو دیکھ تو نہ سکتا تھا لیکن ابھی کسی سوراخ سے اسے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس وقت اس کے دل میں ثابت حضرت پیدا ہوئی کاش ان آوازوں میں اس کے بیوی بچوں کی آواز بھی ہوتی۔ قبر کو مشی سے تمیل ڈھانپ دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی باہر سے آنے والی آوازیں خاموش ہو گئیں۔

قبوں میں اس قدر انہیں چھاکیا کہ اسے قبر کی دیواریں بھی وکھائی نہ دیتی تھیں۔ اسے اس گھنائوپ انہیں میں اپنے اردوگرد اور اوپر یونچ سانپ اور پھونپ نظر آرتے تھے اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان میں سے کوئی ابھی اس پر اپنا زہر بیلانک آزمائے گا اور اسے بلا کر خاکبر سیاہ بنادے گا۔ اچانک ایک خوفناک آواز آتی ہے اور قبر اسے انھا کر باہر پھینک دیتی ہے۔ وہ سخت حیران ہوتا ہے کہ اس قبرستان کی ساری قبور نے اپنے مردود کو قبور سے باہر پھینک دیا ہے۔ سارے قبور دا لے خوف کے عالم میں تھر تھر کانپ رہے ہیں کہ انہیں حکم ہوتا ہے کہ حشر کے میدان کی طرف بھاگو۔ جہاں تم سے تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ سب سرپٹ حشر کے میدان کی طرف اس سرعت و تیزی سے بھاگتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں وہ حشر کے میدان میں موجود ہوتے ہیں۔

میدان حشر میں ان گنت انسان جمع ہیں۔ لوگ سخت کھراہت میں ہیں اور ریوڑوں کی صورت میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ سورج کی تمازت سے انسانی جسموں سے چبی چکلہ رہی ہے۔ زبانیں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں۔ شدت پیاس سے ہونٹ اور زبانیں پھٹ چکلی ہیں۔ بھوک کا یہ عالم ہے کہ انسان کہنیوں تک اپنا گوشت کھا چکے ہیں۔ انسانی رشتنے کے وھاگے کی طرح نٹ پھکے ہیں۔ کوئی کسی کامگزار اور پرسان حال نہیں۔ ماں باپ اولاد کو دیکھ کر بھاگتے ہیں اور اولاد ماں باپ کو دیکھ کر دوڑ جاتی ہے کہ کیس کوئی ہم سے نیکل نہ مانگ لے۔ ہر انسان نفسی نفسی پکار رہا ہے۔ زمین اس قدر گرم ہے کہ اس پر پاؤں نہیں نکلتے۔ ہر انسان اپنے گناہوں کے مطابق پیٹے میں ڈوبتا ہوا ہے۔

اچانک وہ دیکھتا ہے کہ ایک بست بڑا گروہ میدان حشر کی ایک سوت کو بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اس تیزی سے بھاگ رہا ہے جیسے بکریوں کا ریوڑ جملہ آور شیر کو دیکھ کر بھاگتا ہے، لیکن اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ گروہ کسی سکون گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اس گروہ کے ایک فرد کو روک کر پوچھتا ہے کہ تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟ اسے بتایا جاتا ہے کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر شافع محشر بنابر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار لگا ہے اور یہ پریشان حال لوگ شفاعت رسول حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر پر تشریف فرمائیں اور اپنے پیاس سے امیبوں کو جام کوثر بھر کر پلا رہے ہیں اور جو ایک جام پی لے اسے پھر دوبارہ پیاس نہیں لگے گی۔ اس نے دیکھا کہ بست سے لوگ پردا نہ شفاعت حاصل کر کے اور جام کوثر پی کر سوئے جنت جا رہے ہیں۔ اب ان پر کوئی غم نہیں، وہ

شاداں و فرحاں ہیں، ان کے چرے ستاروں سے زیادہ تباہاک ہیں اور ان کے قلوب اطمینان کی دولت سے ملا مال ہیں۔ جنت کی بھاریں ان کے لیے چشم براہ ہیں۔ رضوان جنت ان کے استقبال کا منتظر ہے۔ یہ فرحت بخش منظردیکھ کر ثم سے ڈوبا ہوا اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا اور وہ شفاعت رسول کا پروانہ اور جام کوثر حاصل کرنے کے لیے دوڑنے لگا، لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی غیر مرکی طاقت نے اسے روک لیا ہے۔ اس کے قدموں میں کسی نے میخیں ٹھونک دی ہیں۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا ضمیر اس کی راہ میں ہمالیہ پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کا ضمیر ایک شعلہ بیان مقرر کی طرح بے ہکان بولنے لگا۔ اس کا ضمیر کہنے گا:

”اے بے وفا بے مرد انسان! کس منہ سے شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا رہا ہے۔ تیرا ان سے کیا تعلق؟ تیرا ان سے کیا واسطہ؟ تیرا ان سے کیا رشتہ؟ تجھے ان سے کیا محبت؟ تجھے ان سے کیا چاہت؟ تیری زندگی میں جب تو جوان تھا، مرزا قادریانی نے شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ڈاک ڈالا۔ تو نے کیا کیا؟“

مرزا قادریانی اور اس کے بد معاش ساتھیوں نے ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہر زار اسی کی تو نے کیا کیا؟
سرورِ کائنات کے قلب اطریپر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید میں مرزا قادریانی نے تحریف و تبدل کیا۔ تو نے کیا کیا؟

مرزا قادریانی نے اپنی بکواسیات کو احادیث رسول کما۔ تو نے کیا کیا؟
مرزا قادریانی نے اپنے مرتد ساتھیوں کو صحابہ رسول کما۔ تو نے کیا کیا؟
مرزا قادریانی نے اپنے چیلوں چانٹوں کو اصحاب بدر کما۔ تو نے کیا کیا؟
پیارے نبی کے پیارے ابو بکر و عمر کو گالیاں دی گئیں۔ تو نے کیا کیا؟
محبوب خدا کی لاڈلی بیٹی فاطمۃ الزہراؑ کے مقابلہ میں مرزا قادریانی کی بیٹی کو سیدۃ النساء کہا گیا۔ تو نے کیا کیا؟

سیدِ الکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے مقابلہ میں مرزا قادریانی کی بیوی کو ”ام المومنین“ کہا گیا۔ تو نے کیا کیا؟
حسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے شرمکہ و مدینہ کے مقابلے میں

مرزا قادیانی کے منہوس شر "قادیان" کو مکہ و مدینہ کما گیا۔۔۔ تو نے کیا کیا؟
 تیرے سامنے اسلام لئتا رہا۔۔۔ قرآن لئتا رہا۔۔۔ رسول رحمت کے
 امتی مرتد ہو کر قادیانی بننے رہے اور تو دولت سیئنے میں مست رہا۔۔۔ تیرے
 کانوں پر کبھی جوں تک نہ بندگی۔۔۔ اتنے بڑے حادثوں نے تیرے دل پر کبھی
 چوت نہ لگائی۔۔۔ اتنے بڑے سانحون نے کبھی تجھے متذکر نہ کیا۔۔۔ اب بتا
 تیرا رسول سے کیا تعلق؟۔۔۔ تیرا رسول سے کیا ناتا؟۔۔۔

وہ حشر کے میدان میں اپنے ضمیر کے سامنے لا جواب کھڑا ہے۔۔۔ ضمیر کے
 سوالوں نے اسے گھائل کر کے رکھ دیا ہے۔۔۔ ضمیر اس کو ایک زوردار دھکا مارتا ہے اور
 کہتا ہے چل اب جنم کو۔۔۔ جہاں کے لکھتے شعلے تیرے منتظر ہیں۔۔۔ جہاں کے پچھو اور
 سانپ تیرے انتظار میں اپنے ذنک لیے بیماری سے لوٹ رہے ہیں۔۔۔ یہ ہولناک منظر
 دیکھ کر اس کے منہ سے ذنک ہوتے بکرے کی طرح ایک دردناک جخ نکلتی ہے۔۔۔ جس کی
 ہولناکی سے وہ خواب سے بیدار ہو جاتا ہے۔۔۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا جسم پیسے
 سے شرابور تھا۔۔۔ تھوڑے اوسان بحال ہوئے تو اس نے ناکہ محلے کی مسجد سے صبح کی
 اذان کی آواز آرہی تھی۔

حضرت بلالؑ کا جانشین کہہ رہا تھا:

ا شهدا ن بحمد ر سول اللہ

ا شهدا ن بحمد ر سول اللہ

وہ آنکھیں کھول کر دیوانہ وار ادھرا وھر دیکھنے لگتا ہے۔ اچانک اس کی نظر سامنے
 گئے کیلنڈر پر پڑتی ہے، جس پر جملی حروف سے لکھا تھا۔

کی مُحَمَّد سے دنا تو نے تو ہم تیرے ہیں
 یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

www.sirat-e-mustaqueem.com



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَكَانِ صَاحِبُ ضَلَالٍ شَيْءٌ وَّ لَا يَرَهُ فَوْتٌ 2329

www.sirat-e-mustaqueem.com

شکر داس آج بہت خوش تھا، اس کی خوشیوں کا سمندر بیکار تھا۔ آج اسے محکمہ نمر کی جانب سے ملازمت کا لیٹر ملا تھا۔ بیشیت سینٹر گلرک لاہور میں اس کی تعیناتی ہو چکی تھی۔ اب اسے فوری طور پر اپنا آبائی شریعت حیانہ چھوڑ کر لاہور جانا تھا۔ وہ مسرت بھری سیٹیاں بجا تا ہوا اپنے ساتھ لے جانے والا ضروری سامان اکٹھا کر رہا تھا۔ اگلے دن بذریعہ ٹرین اس کی لاہور روانگی تھی۔ وہ ماں ہاپ کا سب سے بڑا پچھہ تھا اور ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ماں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنی دعاوں کی چھاؤں میں اسے روانہ کیا۔ وہ لاہور پہنچا تو سیدھا اپنے دفتر گیا اور اپنی آمد کی رپورٹ کی۔ آفس پرنسنڈنٹ نے اسے اسی دن سے کام شروع کرنے کا حکم دیا اور اس نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے دفتری کام کا افتتاح کر دیا۔ لاہور میں شکر داس کا کوئی بھی جانے والا نہ تھا۔ اس نے اسے پہلے چند دن ہوٹل میں گزارنے پڑے۔ پھر اسے محکمہ کی طرف سے کوارٹر دے دیا گیا۔ اس کے کوارٹر کی اگلی لائن میں اس کا پرنسنڈنٹ بھی رہتا تھا۔ جو دفتر میں پرنسنڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبردست قادریانی بیٹھ بھی تھا۔

ایک دن قادریانی پرنسنڈنٹ نے اپنی بیوی کو کہا کہ ہمارے دفتر میں ایک ہندو لڑکا بھرتی ہوا ہے، جو مبالغے کی حد تک خوبصورت اور انتہائی وجیسہ ہے۔ لاہور شر میں نیا نیا آیا ہے، یہاں اس کی کسی سے جان پہچان نہیں۔ کسی اچھے گھر کا فرد معلوم ہوتا ہے کیوں نہ اس پر محنت کر کے اسے قادریانی ہالیا جائے۔ پہلے اسے اپنے اخلاق کے آئینے میں اتار کر اپنا گردیدہ کیا جائے پھر اس کے ذہن کو قادریانیت کی غذا دی جائے اور آہستہ آہستہ اس کے دماغ پر قادریانیت کی حکمرانی قائم کر دی جائے۔ پرنسنڈنٹ کی بیوی کو اپنے خاوند کی تجویز تو بہت پسند آئی لیکن اس نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں پتہ ہے، اپنی رضیہ جوان ہو چکی ہے اور مجھے اس کے رشتے کی سخت گلگر ہے، کیوں نہ اسے دام محبت میں پھسا کر رسول میرج کر لی جائے۔ کچھ دیر بعد اولاد کے جنجال میں پھنس کر خود ہی قادریانی ہو جائے گا۔ پرنسنڈنٹ جو اپنی بیوی سے زیادہ کثر قادریانی تھا اس نے غصہ میں اپنی بیوی کی بات کو

رد کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی بیٹی کی شادی کسی ہندو سے نہیں کر سکتے، تم بے شکر رہو، میں اسے بہت جلد قادریانی بنا لوں گا اور ایک تیر سے دوشکار ہو جائیں گے۔

اگلی صبح پر شنڈنٹ نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت شنکر داس کو اپنے پاس بلایا اور کہا:

”بیٹا! تم اپنا وطن چھوڑ کر پر دیں میں آئے ہو۔ تمہیں ماں باپ اور بہن بھائیوں کی یاد ستاتی ہو گی لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم تمہارے ماں باپ ہیں، ہمارے پنجے تمہارے بہن بھائی ہیں، جب بھی تمہارا دل اداس ہو، بے دھڑک ہمارے ہاں چلے آؤ، ہمارا گھر تمہارا گھر ہے اور تم ہمارے فیملی ممبر ہو اور ہاں۔۔۔ آج شام کا کھانا تمہیں ہمارے ساتھ کھانا ہو گا۔ ضرور آنا میں انتظار کروں گا۔۔۔“

شنکر داس مسکرا یا اور اس نے دعوت قبول کر لی۔ شام کو وہ پر شنڈنٹ کے گھر پہنچ چکا تھا۔ پر شنڈنٹ نے ایک پر ٹکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ کھانے کے بعد پر شنڈنٹ نے شنکر داس سے اپنی بیوی اور بچوں کا تعارف کرایا اور پہلی ہی ملاقات میں آپس میں بہت بے تکلفی ہو گئی۔ دعوت سے فارغ ہونے کے بعد شنکر داس جب گھر پہنچا تو وہ پر شنڈنٹ اور اس کے اہل خانہ سے بہت متاثر تھا۔ اسے پر دیں میں اپنے گھر کی محبت ملی تھی۔ اسے غریب الوطنی میں ماں باپ کا پیار ملا تھا اور اسے اپنے گھری مہک محسوس ہوئی تھی۔

پر شنڈنٹ دعوت کی سیڑھی کے ذریعے شنکر داس کے دل میں اتر چکا تھا اور اس کے دل میں اپنے اعتماد کا ٹمپہ لگا چکا تھا۔ پھر پر شنڈنٹ گاہے گاہے اسے چائے اور کھانے پر بلاتا رہا۔ ایک دن پر شنڈنٹ نے اپنی بیوی سے کہا، ”اب شنکر داس کافی حد تک ہمارے اخلاق کے آئینے میں اتر چکا ہے اور وہ ہمیں انہا محسن اور غم خوار سمجھتا ہے، لہذا اب کیوں نہ اس پر قادریانی تبلیغ کا عمل شروع کیا جائے؟“

”ہاں ہاں“ کون لمحہ صائم کیے بغیر ہمیں اسے قادریانی بنانے کا کام شروع کر دیا چاہیے۔ پر شنڈنٹ کی بیوی نے متکرانہ انداز میں کہا۔ دو دن بعد پر شنڈنٹ نے شنکر داس کو اپنے بان چائے پر مدعو کیا۔ چائے کے دور کے بعد گفتگو کا دور شروع

ہوا۔ شکار پر گھات لگائے جملہ کرنے والے مگر مجھ کی طرح بیٹھے ہوئے سپرشنڈنٹ نے اس سے کہا:

”بیٹھا! یہ بھولی بھالی دنیا بڑی دیر سے صحیح موعد اور امام مهدی کا انتظار کر رہی ہے۔ دنیا والوں کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ امام مهدی اور صحیح موعد دو شخصیات نہیں بلکہ ایک ہی شخصیت ہے اور اس محترم شخصیت کا نام مرزا غلام احمد قادریانی ہے، جو قادریان میں تشریف لائے اور اپنا فریضہ ادا کر کے قادریان ہی میں انتقال کر گئے اور ان کی قبر بھی قادریان میں ہے۔“

پھر سپرشنڈنٹ نے مرزا قادریانی کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہا:

”مرزا غلام احمد قادریانی صاحب اللہ کے نہایت برگزیدہ نبی تھے۔ اس دنیا میں ان کے ہاتھوں لاکھوں معجزات رونما ہوئے۔ لاکھوں بھلکے ہوئے انسانوں کو ان کے ذریعے ہدایت کی روشنی نصیب ہوئی۔ وہ اللہ کے اتنے محبوب نبی تھے کہ اللہ پاک نے ان کی ذات میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام کی صفات جمع کر رکھی تھیں۔ انہوں نے وہ وہ مرکے سر کیے جو کسی نبی سے نہ ہو سکے۔ بیٹھنکر داس! ہمیں بھی سچائی اور حقانیت سے محبت کرنی چاہیے اور کائنات کے اس عظیم چے اور حوت پرست انسان سے محبت کرنی چاہیے اور اس سے ایک طاقتور تعلق پیدا کر لینا چاہیے۔“

شکر داس مسکرا کر سپرشنڈنٹ کی باتیں سنتا رہا۔ جس سے سپرشنڈنٹ یہ تاثر لیتا رہا کہ اس کی باتیں شکر داس کے دل میں اتر رہی ہیں اور اس کے چرے کی مسکراہٹ اس بات کی تصدیق کر رہی ہے۔ سپرشنڈنٹ خوشی سے پھول کر کپا ہو رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس کی گفتگو کے ابتدائی تیر عین اپنے ہدف پر گئے ہیں۔ شکر داس کے جانے کے بعد اس نے اپنی بیوی کو خوشخبری دی کہ شکر داس نے بہت خوشی خوشی میری باتیں سنی ہیں اور میری باتیں اس کے چرے پر مسکراہٹ کے پھول کھلاتی رہی ہیں، بس عنقریب شکار اپنے قفس میں مقید ہو گا۔

شکر داس جب گھر پہنچا تو سارے دن کی تھکاوٹ کی وجہ سے وہ جاتے ہی چارپائی پر لیٹ گیا اور سوچ کی لمبی واڈیوں میں سیاحت کے لیے نکل گیا۔ اس کے

کالوں کے پردوں پر سپرنشنڈنٹ کے جملے زور زور سے گمراہے تھے۔ لدھیانہ کا باسی ہونے کی وجہ سے وہ مرزا قادریانی کو جانتا تھا کہ وہ نبوت کا جموٹا مدھی تھا۔ کیونکہ لدھیانہ کے مسلمان علماء نے سب سے پہلے مرزا قادریانی پر کفر کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ اس نے اپنے باب دادا کی زبانوں سے وہ عظیم داستانیں بھی سنی تھیں جو علمائے لدھیانہ نے جھوٹی نبوت کی سرکوبی میں رقم کی تھیں۔ اس لئے اس کے دل میں بھی اس جھوٹے نبی کے خلاف ایک نفرت تھی۔

چار پانچ روز بعد سپرنشنڈنٹ نے پھر شکر داس کو چائے پر بلایا، بسکٹ اور یک پیشہ سے تواضع کی۔ چائے کے بعد اس ٹکاری نے اپنی گفتگو کے پہنچے اپنے ٹکار کے گلے میں ڈالنے شروع کر دیے۔ مرزا قادریانی کے مجذبات کی کہانیاں سنائیں۔ اس کے اخلاق و کردار کے تھے سنائے۔ اس کی شرافت و صداقت کا تذکرہ کیا۔ اس کے زہد و تقویٰ کی مثالیں دیں۔ اس کی پیشین گوئیاں بیان کیں۔ سپرنشنڈنٹ بے مکان بول رہا تھا اور شکر داس اس کے ہر جملے کے جواب میں ہلکی ہلکی مسکراہٹ دے رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سپرنشنڈنٹ کو حوصلہ اور اطمینان عطا کر رہی تھی اور وہ خوشی سے نماز ہو رہا تھا کہ ٹکار جال میں آ چکا ہے۔ گھر پہنچ کر سپرنشنڈنٹ نے اپنی بیوی کو ساری روادوں سنائی اور بتایا کہ شکر داس میری ہربات کے آخر میں مسکراتا ہے اور اس کی مسکراہٹ اس کی اندر وہی کیفیت کی نمائندہ ہوتی ہے اور میں اپنے تجربے کی بیان پر کہہ سکتا ہوں کہ ”لوکا“ پھپٹر نیمود قادریانی ہو چکا ہے، بس تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ وہ قادریانی بھی ہو چائے گا اور رضیہ کا رشتہ بھی ہو چائے گا۔

ایک ماہر شاطر کی طرح تقریباً ایک ہفتہ کے بعد سپرنشنڈنٹ نے شکر داس کو پھر چائے پر بلایا۔ گرم گرم چائے کی چکیوں کے دوران قادریانیت کی چیکیاں بھی چلتی رہیں۔ وہ بسکٹوں کے ساتھ ساتھ اسے قادریانی تعلیمات کے بسکٹ بھی کھلاتا رہا۔ شکر داس بھی جی کر کے سنتا رہا اور مسکراہٹیں بکھیرتا رہا، جس سے سپرنشنڈنٹ کے دل میں خوشی سے شہنازیں بھتی رہیں۔ رات زیادہ ہونے پر اس نے شکر داس کو بڑے تپاک سے رخصت کیا اور جاتے ہوئے اسے ایک لفافہ میں قادریانی تعلیمات پر مبنی پھلفت اور چند کتابیں دیں اور کہا کہ بیٹا انسیں خوب غور سے پڑھنا۔ اب ہفتہ بھر کے بعد تم

سے دوبارہ ملاقات ہوگی اور آئندہ کی نشست میں جی بھر کر پاتیں ہوں گی۔ اس لڑپچھر کو پڑھ کر اگر تمہارے دل میں ٹکلوک و شبہات پیدا ہوں تو انہیں کسی کاغذ پر نوٹ کر لینا تاکہ ان نکات پر تفصیل گفتگو ہو سکے۔

شکر داس کے چلنے والے کے بعد پرشنڈنٹ نے اپنی بیوی کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا:

”ہاتھی گز رکھیا ہے، اب صرف دم باقی ہے اور تم دیکھنا کہ میں کس ماہر انداز سے یہ دم بھی گزار دوں گا۔ میں نے ہر طرف سے اس کا محاصرہ کر لیا ہے اور دلاکل کے تیروں کی یلغار سے اس کی سوچوں کو محبوس کر لیا ہے۔ اس کا دل میری ایک مٹھی میں اور دلائی میری دوسری مٹھی میں ہے۔ اس کے سر پر میرے احسانات کی بھاری گثیردی اور پاؤں میں میری افسری کی بھاری زنجیریں ہیں، اس لئے اب میں چاہتا ہوں کہ اسے مرزا قادریانی کا کلمہ پڑھا کر قادریانی ہنالیا جائے اور جو کیس آج سے دو ماہ قبل ہم نے شروع کیا تھا اپنی مراد کو پہنچے اور تیری مراد بھی پوری ہو۔“

بیوی نے خاوند کی باتوں سے اتفاق کیا اور کہا کہ آئندہ ملاقات آخری ہو اور اس ملاقات میں شکر داس ہندو صف سے لکل کر قادریانی صف میں کھڑا ہو۔

آخر وہ دن آگیا اور شکر داس چائے پینے کے لئے پرشنڈنٹ کے گمراہ میں موجود تھا۔ چائے کی محفل کے بعد گفتگو کی محفل جبی۔ پرشنڈنٹ نے شکر داس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”بیٹا! دنیا کی زندگی چند روزہ ہے اور آخرت کی زندگی دائی۔ ہمیں اپنی حیات مستعار کے چند دن گزار کر اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے اور اپنے عمل کا جواب دینا ہے۔ ایمان کے بغیر اعمال کا کوئی وجود نہیں۔ عقیدہ صحیح نہیں تو بڑے سے بڑا عمل بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بیٹا! اگر ایمان ہو گا تو بہشت کی بھاریں جسم برہ ہوں گی اور اگر ایمان نہیں ہو گا تو جنم کی شعلہ زن ٹکرے سے ہڑپ کرنے کے لئے بیتاب ہوگی۔ بیٹا! تمہاری آخرت سنوارنے کے لئے میں آج تھیں دعوت دینا ہوں کہ تم اللہ کے نبی اور رسول مرزا غلام احمد قادریانی پر ایمان لے آؤ اور ان کی نبوت کا اقرار کرلو،“

کیونکہ مرزا صاحب پر ایمان لانا سب نبیوں پر ایمان لانے کے مترادف ہے۔ مرزا صاحب کی تعلیمات پر ایمان لانا قرآن و حدیث کی تعلیمات پر ایمان لانا ہے اور مرزا صاحب کی تعلیمات کا اقرار کرنا اسلام کا اقرار کرنا ہے۔ میرے پیارے بیٹے! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، معلوم نہیں یہ سانسوں کی ڈور کب ثوث جائے، اس لئے فوری طور پر مرزا صاحب کی نبوت پر ایمان لے آؤ اور ان کے نبی ہونے کا اقرار کرلو۔

پرنٹنڈنٹ کے اس فیصلہ کن سوال پر حنکر داس حسب معقول پھر مسکرا یا اور بالکل خاموش رہا۔

”میرے بیٹے! بولتے کیوں نہیں؟“ پرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔ حنکر داس پھر خاموش رہا۔

”بیٹے! کیا میری باتوں کی تمہیں سمجھ نہیں آئی؟“ پرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

”بالکل اور ہر طرح سے سمجھ آئی۔“ - حنکر داس نے جواب دیا۔

”تو پھر مرزا صاحب پر ایمان لے آؤ۔“

”مرزا صاحب پر ایمان تو نہیں لا سکتا اور کبھی بھی نہیں لا سکتا۔“

”میں دو سینے تم سے منگلو کرتا رہا۔ کیا میری باتوں کو تمہارے ذہن نے قبول نہیں کیا؟“

”بالکل نہیں۔“

”تو پھر میری منگلو کے دوران تم مسلسل کیوں ہستے رہتے تے؟“ پرنٹنڈنٹ نے غصہ سے پوچھا۔

”نہیں تو مجھے اس بات پر آتی تھی کہ ہم نے آج تک چچے نبی کو نہیں مانا اور تم جھوٹ کو منوار ہے ہو۔“ - حنکر داس نے ہستے ہوئے جواب دیا۔





اسنڈر کی طرف

عالیٰ مجلس تحریف ختم بوت نہ کانے صاحب ضلع شیخوپورہ

وہ دو دن اور دو راتوں کے بعد واپس لوٹا ہے۔ اس کا جسم تھکن سے چور ہے۔ اس کے اعضا اس سے سکون طلب کر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں اس سے نیند کا سوال کر رہی ہیں۔ اس کی ابھرتی ہوئی جوانی، وجہہ چہرہ اور کندھے پر لگلی ہوئی کلا شکوف دیکھ کر مرشد اقبال کا وہ رزمیہ کلام پڑھنے کو جی چاہتا ہے

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشنا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی نھوکر سے صحراء دریا
سبت کر پھاڑ ان کی بیت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنا!

○

ہر لحظہ ہے مومن کی ننی شان ننی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی بربان
قماری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بتا ہے مسلمان
جس سے جگر لالہ میں مھنڈک ہو، وہ جہنم
دریاؤں کے دل جس سے دل جائیں وہ طوفان

وہ ایک پھاڑ کی چھوٹی سی کھوہ میں آکر بیٹھ گیا ہے۔ جہاں وہ بیٹھا ہے، اس سے دو فٹ کے فاصلے پر پتھر کی نوک سے ۸۸ کا ہندسہ لکھا ہوا ہے۔ وہ آتے ہی اپنے ہاتھ سے ۸۸ کا ہندسہ منا کر ۹۳ کا ہندسہ لکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کشمیری گوریلا فائز نے پہلے ۸۸ ہندو جنم واصل کیے تھے، اب تازہ شکار کرنے کے بعد ان کی تعداد ۹۳ ہو گئی ہے۔ وہ

پندرہ میں منٹ ستانے کے بعد پھاڑ کی کھوہ سے باہر نکلا تاکہ اردو گرد کا جائزہ لے سکے۔ باہر کشیر اپنے فطرتی حسن کا جادو جگا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک شفاف پانی کی ندی گنگاتی ہوئی اپنی منزل کی جانب روائی دواں تھی۔ سارا دن روشنیوں کی بزم سجا کر سورج ایک سرخ گولے کا روپ دھار کر مغرب کی گود میں سونے کے لیے جا رہا تھا۔ چرداست اپنی مسحور کن مخصوص آواز میں بھیز بکریوں کو پھاڑی چراگاہوں سے اپنی جانب بلارہتے تھے۔ صبح سورے روز کی تلاش میں نکلے ہوئے پرندے نولیوں کی صورت میں واپس اپنے آشیانوں کی طرف بوٹ رہتے تھے۔ آسمان کی وسعتوں میں کہیں کہیں سفید آوارہ بادل تیر رہتے تھے۔

مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو شیر خان نے قربی پھاڑی ندی سے وضو کیا اور زمین پر ایک چھوٹی سی چادر بچھا کر اپنے رب کے دربار میں حاضر ہو گیا۔ نماز سے فراغت کے بعد شیر خان نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے پھیلایا اور اپنے مالک سے رازو نیاز کی گفتگو کرنے لگا۔ دعا کے بعد اس نے اپنے ہاتھ چہرے پر پھیرسے ہی تھے کہ اسے دور سے کوئی شخص اپنی جانب دوڑتا ہوا نظر آیا۔ اسے آتا دیکھ کر شیر خان پیٹتے کی طرح چوکنا ہو گیا اور اپنی کامشکوف کی نالی اس کی طرف سیدھی کر لی۔ لیکن قریب آنے پر اسے دیکھ کر شیر خان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اسے زور سے سینے سے اگالیا۔ آنے والا اس کا مقابلہ سا تھی تھا، جو اس کے لیے ایک اہم پیغام لے کر آیا تھا۔ آنے والے مقابلہ نے اسے بتایا کہ ہمیں ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ بھارتی فوجیوں کی مدد کے لیے اسرائیلی کمانڈوز کشیر پہنچ گئے ہیں اور وہ ڈل جہیل کے کنارے ایک باؤس بوٹ میں مقیم ہیں۔ آج ہمارا ان پر شب خون مارنے کا پروگرام بن چکا ہے۔ تم رات بارہ بجے فلاں مقام پر پہنچ جانا۔ کمانڈر کی بدایات کے بعد نھیک رات اڑھائی بجے جملے کا پروگرام ہے۔ پیغام برپیغام دے کر چلا گیا۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد شیر خان تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ وہ نھیک بارہ بجے بتائے ہوئے ٹھوکائے پر پہنچ چکا تھا۔ وہاں پر پسلے سے پہنچ ہوئے مقابلہ اس کا انتظار کر رہتے تھے۔ سب مقابلہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے ایک دوسرے کی خیریت و ریافت کی، پھر باقاعدہ مینٹ کا آغاز ہوا۔ سارے پروگرام کو حصی شکل دی گئی۔ کمانڈر نے سب مقابلہ یں کو حکم دیا کہ وہ دونوں نسل صلوٰۃ حاجت ادا کریں۔ سب نے صلوٰۃ حاجت ادا کی۔ اس کے بعد کمانڈر نے ایک دلوالہ انگلیز اور جہاد پرور تقریر کی، جس نے مقابلہ یں میں ایک نیا جوش اور چذبہ پیدا کر دیا۔ اس کے

بعد کمانڈر نے اپنی مسم کی کامیابی کے لیے ایک رفت انگیز دعا مانگی، جس سے مجاہدین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ سواد دبکے سات مجاہدین پر مشتمل یہ قافا۔ ذل جمیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ذل جمیل تک پہنچنے کے لیے مجاہدین نے ایک انتہائی محاط راست اختیار کیا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ ان کے راستے کی سب سے بڑی مشکل ایک چھوٹی اور عارضی فوجی چوکی تھی، جہاں پر چھہ ہندو فوجی تعینات تھے۔ مجاہدین نے دور سے چوکی کو دیکھا تو انہیں کوئی فوجی نظر نہ آیا۔ آخر شیر خان کی بہادری اور جنگی مهارت کو دیکھتے ہوئے کمانڈر نے اس کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ چکے چکے جائے اور چوکی کا جائزہ لے کر آئے۔

شیر صفت شیر خان نے بصد خوشی اس چیلنج کو قبول کیا اور کلاشکوف کندھے پر لاکائے چھیتے کی پھرتی سے اپنے ہدف کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم انہاتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جب چوکی تقریباً دوسو فٹ کے فاصلے پر رہ گئی تو وہ کہنیوں کے مل رینگتا ہوا چوکی کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ چوکی کے قریب جا کر وہ دیکھتا ہے کہ دبائیں ایک بلب روشن ہے، جس کی روشنی میں اسے تین ہندو فوجی صاف نظر آ رہے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں تھیں اور وہ جام سے جام نکراتے ہوئے غنا غاث شراب پی رہے تھے۔ شیر خان پہنڈ قدم مزید آگے بڑھا اور اس نے دیکھا کہ تینوں ہندو فوجی بری طرح شراب میں بد مست ہو چکے ہیں اور انہیں اپنے آپ کا ہوش نہیں۔ ہندو فوجیوں کے پاس بہت سی شراب کی خالی بوتلیں بکھری پڑی تھیں، بولب کی روشنی میں چمک چمک کر اپنے ہدوں کا انہصار نہ رہی تھیں۔ اتنی زیادہ تعداد میں خالی بوتلوں سے شیر خان نے اندازہ لگایا کہ باقی تین ہندو فوجی شراب کے نش سے چور ہو کر اندر کمرے میں پڑے ہوں گے۔ جوش میں آکر اس کا بھی چاہا کہ وہ ایک ہی یلغار میں ان سارے ہندو فوجیوں کو واصل جنم کر دے لیکن امیر کی اماعت نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

وہ انتہائی احتیاط سے واپس پلتا اور کمانڈر کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ کمانڈر نے سب کو بلایا اور فوجی چوکی پر چکے سے بجلی کی سرعت سے حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مجاہدین احتیاط کا دامن تھا بے چھپتے چھپتے چوکی کی طرف بڑھے اور چوکی کے قریب پہنچ کر انہوں نے رینگنا شروع کر دیا۔ کمانڈر، جس کا نام خالد تھا، مجاہدین کی قیادت کر رہا تھا۔ چوکی کے بالکل قریب پہنچ کر کمانڈر خالد نے ہندو فوجیوں اور گرد و نواح کا جائزہ لیا، پھر اس نے باقی کے اشارہ

سے حملہ کا سُنگل دیا۔ مجاہدین طوفانی لروں کی طرح پھرے ہوئے ان پر لپکے اور آنا ”فانا“ انہیں دبوچ لیا۔ تین مجاہدین نے کمرے میں پڑے شراب کے نشے میں دست فوجیوں کو قابو کر لیا اور پھر ان سب کے منہ اور آنکھوں پر پیاس باندھ دی گئیں اور ان کے ہاتھ الٹی طرف باندھ دیے گئے اور پھر شیر خان نے بے آواز پستول سے ان مردوں کو جہنم واصل کر دیا۔ اب شیر خان کا سکور ۹۹ ہو چکا تھا۔ مجاہدین نے فوجیوں سے حاصل کردہ اسلحہ قریب ہی ایک محفوظ مقام پر چھپا دیا تاکہ آپریشن سے واپسی پر اسے وہاں سے حاصل کر سکیں۔

اب مجاہدین کا رخ اپنے اصل ہدف ڈل جھیل کی طرف تھا۔ وہ ڈل جھیل کے قریب پہنچ گئے اور عقاب کی آنکھوں سے ہاؤس بوٹ کا جائزہ لینے لگے اور پھر بجلی کی پھرتی سے ہاؤس بوٹ کو گھیرے میں لے لیا۔ کمانڈر خالد نے اپنی گر جدار آواز میں ہاؤس بوٹ میں چھپے ہوئے کمانڈوز کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا، لیکن اندر سے کوئی جوابی آوازنہ آئی۔ اسرائیلی کمانڈوز کو گرفتار کرنے کے لیے جو نئی شیر خان ہاؤس بوٹ میں داخل ہونے لگا تو ایک اسرائیلی کمانڈو نے اس پر کلاشنکوف کا فائر کھوول دیا۔ گولیاں اس کے جسم کو چھلنی کرتی ہوئی نکل گئیں اور وہ خون میں نہایگیا، لیکن شیر خان کی فوری جوابی فائرنگ سے اسرائیلی کمانڈو بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اور پھر سب مجاہدین کی جوابی فائرنگ سے خاموش فضا خوفناک تڑپتے سے گونج اٹھی۔ اسرائیلی کمانڈوز کی جانب سے فائرنگ بند ہو گئی اور وہ ہاؤس بوٹ کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ فضائیں پھر کمانڈر خالد کی گر جدار آواز گونجی اور اس نے اسرائیلی کمانڈوز کو خبردار کیا کہ اگر تم نے خود کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم ابھی دستی بہوں سے ہاؤس بوٹ کے پر پھی اڑادیں گے۔ یہ اعلان سن کر اسرائیلی کمانڈوز نے خود کو مجاہدین کے حوالے کر دیا۔

اسرائیلیوں کی کل تعداد آٹھ تھی، جن میں سے ایک شیر خان کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا۔ مجاہدین نے انتہائی عجلت سے ان کمانڈوز کے ہاتھ الٹے ہاندھے اور ان کے منہ اور آنکھوں پر پیاس باندھ دیں اور انہیں ہاتکتے ہوئے اپنے ایک خفیہ مقام پر لے آئے۔ دو ساتھیوں نے اپنے ہاتھوں میں زخمی شیر خان کو اٹھایا ہوا تھا، جو شدید زخمی تھا۔ خفیہ مقام پر پہنچتے ہی مجاہدین نے اسرائیلی کمانڈوز سے پوچھ چکھ کا سلسہ شروع کر دیا۔ مجاہدین اس بات پر سخت حیرت میں تھے کہ ان کے قیدی اسرائیلیوں کی طرح گورے چٹے نہیں بلکہ گندی اور سانو لے رنگ کے ہیں۔ ان کے نقوش اور چڑے مرے بھی اسرائیلیوں جیسے نہیں۔ اس

کے علاوہ وہ عرب بھی نہیں بول سکتے تھے، صرف انگریزی میں بات چیت کرتے تھے۔ مجاہدین کی ڈائٹ ڈپٹ پر انہوں نے بتایا کہ وہ ہنگامی اور اردو بڑی روائی سے بولتے ہیں۔ مجاہدین نے ان سے کہا کہ تم اسرائیلی معلوم نہیں ہوتے۔۔۔ پھر ہمارے مخربے تمہیں اسرائیلی کیوں کہا؟ ہلکے تشدد کے بعد انہوں نے اکٹشاف کیا کہ وہ قادریانی ہیں اور ان کا تعلق پاکستان سے ہے۔ وہ اسرائیلی فوج میں باقاعدہ بھرتی ہیں اور انہوں نے گوریلا ٹریننگ اسرائیل سے ہی حاصل کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت اسرائیلی فوج میں ایک ہزار قادریانی بھرتی ہیں۔ انہوں نے مجاہدین کو یاد دلاتے ہوئے کہا کہ بھٹو دور میں قوی اسیبلی میں یہ ہنگامہ خیز آواز اٹھی تھی اور مولانا ظفر احمد انصاری نے قوی اسیبلی کو بتایا تھا کہ اسرائیل میں چھ سو قادریانی فوجی بھرتی ہیں۔ مولانا نے اس سلسلہ میں قوی اسیبلی کے ممبران کو دستاویزی ثبوت بھی دکھائے تھے۔ انہوں نے مجاہدین کو بتایا کہ بھارت کی مدد کے لئے کئی اور محاذوں پر بھی قادریانی جاسوسی اور فوجی خدمات پر مامور ہیں۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں اعلیٰ عمدوں پر جو قادریانی بیٹھے ہیں، ہمارے ان کے ساتھ مسلسل رابطے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ نسا" اسرائیلی کمانڈوز کی بجائے انہیں صرف اسی لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ ٹکل سے ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں اور کوئی شخص ہمیں چرے کی شناخت سے اسرائیلی نہیں کہہ سکتا۔ مجاہدین نے اسرائیلی کمانڈوز سے مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے انہیں اپنے ہیڈ کوارٹر بھجوادیا۔

خون میں نمایا ہوا شیر خان اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کے خون کی خوبصور دگر کی نظما کو معطر کر رہی تھی۔ اس کے چرے پر ایک عجیب ہالکن اور مسکراہٹ تھی۔ اتنا خون بننے کے باوجود اس کی آنکھوں میں جگنو چک رہے تھے۔ وہ انتہائی خوش تھا کہ وہ اپنی مم کمل کر چکا ہے۔ رات اپنی مسافت ختم کر چکی تھی۔ موزن نے صبح کی اذان دی۔۔۔ جب موزن نے اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ کی پکار دی۔۔۔ تو اپنے اللہ کا نام سن کر شیر خان کے چرے پر اک مسکراہٹ پھیل گئی اور اس لطیف مسکراہٹ کے ساتھ ہی اس کی لطیف روح نفس غفری سے پرواز کر کے سوئے جنت روانہ ہو گئی۔۔۔ وہ جنت۔۔۔

جہاں حوریں اس کے انتظار میں بے قرار ہوئی جا رہی تھیں۔۔۔
جہاں جنت کی بہاریں اس کے لئے چشم برہ تھیں۔۔۔
جہاں کوڑو تنسیم بھتی ہیں۔۔۔

جہاں مشکل و غیر سے لبریز ہوا میں چلتی ہیں۔۔۔

جہاں جنتیوں کے لیے تنتوں پر گاؤں تکنے بچھائے جاتے ہیں۔۔۔

جہاں ہر خواہش نبپ آنے سے پہلے پوری ہو جاتی ہے۔۔۔

جہاں شہیدوں کا استقبال کیا جاتا ہے۔۔۔

جب تک جلیں نہ دب شہیدوں کے لئے سے

سنتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا

پہاڑ کی کھوہ میں شیر خان کے مقدس ہاتھوں سے ۹۳ کا ہند سہ لکھا ہوا موجود تھا۔۔۔

لیکن شیر خان تو سات مرید کافر جنم رسید کر کے اپنی سپنخی مکمل کر چکا تھا۔ کاش کوئی وہاں جا کر ۹۳ کے عدو کو منا کر ۱۰۰ الکھ دے تاکہ پہاڑ کو بھی پتہ چل جائے کہ اس کی دھرتی کا بینا اپنی سپنخی مکمل کر چکا ہے۔



شہرِ صورتِ حب کر!



کاؤں سے فیٹ کلاس میں لی۔ اے کرنے کے بعد اکبر خان ایم۔ اے کرنے کے لئے لاہور منتھل ہو گیا۔ اے چنگاب یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور اس نے یونیورسٹی ہوش میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ وسیع و عریض یونیورسٹی کے سامنے ماحول میں جلد ہی اس کی طبیعت رج بس گئی اور وہ اسماک کے ساتھ اپنی پڑھائی میں صروف ہو گیا۔ اتفاق کی بات کہ ہوش میں اس کے ساتھ دالے کمرے میں ایک قادریانی نوجوان رہتا تھا۔ اس چالاک اور شاطر قادریانی نوجوان نے اکبر خان کو اپنے جال میں پھنسانے کا منصوبہ بنایا اور ایک طے شدہ پروگرام کے تحت اس نے اکبر خان سے گرمی دوستی پیدا کر لی اور اس کے دل میں اپنے اعتاد کی جگہ بنالی۔ اب اس قادریانی نوجوان نے اکبر خان کو دھیرے دھیرے قادریانیت کی تبلیغ کرنا شروع کر دی۔ پھر اسے قادریانی لٹرچر پڑھانا شروع کیا۔ وہ اسے کئی دفعہ لاہور کے قادریانی مرکز میں لے کر گیا، جہاں اس کی پر ٹکلف دعویٰں کی جاتیں اور اسے تھائیں سے نوازا جاتا۔ قادریانی نوجوان اسے کئی دفعہ روہ بھی لے کر گیا جہاں اسے بڑے بڑے قادریانیوں سے ملایا گیا، مختلف شعبہ جات کا دورہ کرایا گیا اور بہشتی مقبرہ کی سیر کرائی گئی۔

وقت اپنے محرک پھیوں کے ساتھ اپنی منزل کی جانب روائی دوں رہا۔ لیل و نمار کی گردش جاری رہی اور اکبر خان کے دل و دماغ پر قادریانی تعلیم کی یلغاریں ہوتی رہیں۔ ایک سامنے انداز سے اس کی بین و اشکنگ ہوتی رہی۔ جب اس ارتادادی تبلیغ کو ایک سال بیت گیا تو اکبر خان قادریانی مذہب قبول کر چکا تھا، لیکن اس کے والدین کو خبر نہ ہوئی کہ ان کے ساتھ کتنا برا سانحہ ہو چکا ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کا بیٹا جو لاہور تعلیم کے زیور سے مالا مال ہونے گیا تھا، زیور ایمان سے بھی محروم ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنے جس لخت جگر کو روشنیوں کے شر بھیجا تھا، وہ ارتاداد کے اندھے کنوئیں میں گر چکا ہے۔ اس دوران اکبر خان گھر آتا جاتا رہا، لیکن اس نے اس خبر کی بھنگ کسی کے کانوں میں نہ پڑنے دی۔

دو سال بعد جب وہ ایم۔ اے کامتحان دینے کے بعد یونیورسٹی سے فارغ ہو کر گھر واپس لوٹا تو اپنے دیگر سامان کے ساتھ قادریانی لٹرچر اور کتابوں کے بندھ بھی لے آیا۔ ایک دن اس کے والد کی جب قادریانی لٹرچر پر نظر پڑی تو وہ چونک اٹھے۔ انہوں نے ساری قادریانی کتابوں پر

سرسری نظرڈالی تو وہ حیران و پریشان تھے کہ ان کے بیٹے کے پاس یہ مسلک کتابیں کماں سے آ گئیں۔ ابھی وہ اسی پریشانی میں غرق تھے کہ باہر سے اکبر خان بھی آگیا۔
”یہ کتابیں کس کی ہیں؟“ باب پنے بیٹے سے پوچھا۔

”میری ہیں۔“

”تم یہ کتابیں کماں سے لائے ہو؟“

”لاہور سے۔“

”تمہارا ان کتابوں سے کیا تعلق؟“

”میں ان کا مطالعہ کرتا ہوں۔“

”تمہاری ان سے کیا دلچسپی؟“

”میری ان سے نہ ہی دلچسپی ہے؟“

”کیا تم قادیانی ہو چکے ہو؟“ باب پنے حیرت سے پوچھا۔

”بی بان! میں قادیانی نہ ہب قبول کرچکا ہوں“ اکبر خان نے دونوں جواب دیا۔
بوڑھا باب سر پکڑ کے بینہ گیا، جیسے اس کے سر کسی نے بھاری ہتھوڑا دے مارا ہو۔
باب بیٹے کی تلحیح کا شور سن کر سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ اکبر خان کا باب زور زور سے چار رہا
تھا۔

”میرے گھر سے ابھی دفع ہو جاؤ۔ میں کسی مرتد کا وجود اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

اکبر خان کے بھائیوں نے باب کے جذبات کو نہ صحت اکیا اور باب کو سمجھایا کہ اسے گھر سے نکالنے سے معاملہ مزید گزر جائے گا۔ وہ مزید پکا ہو جائے گا اور قادیانی بھی خوش ہوں گے کہ اچھا ہوا گبر والے چھوٹے! ہم علمائے کرام کو بلا کر بھائی کی ذہنی صفائی کرائیں گے۔ اس کے شکوک و شبہات دور کریں گے اور انشاء اللہ اے ارماد کے خارستان سے نکال کر دوبارہ اسلام کے گلستان میں لا میں گے۔ باب نے اس حد تک بیٹوں کی بات سے اتفاق کیا۔ مختلف جید علمائے کرام کو بلا یا گیا اور اکبر خان سے ان کی ملاقاتیں کرائی گئیں۔ سوال و جواب کی طویل نشست ہوتی رہیں۔ رو قادیانیت پر علمائے کرام کے کاث وار دلائل سے اکبر خان کث کث اور بکھر بکھر جاتا۔ جب لا جواب ہو جاتا تو ہر بار یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتا کہ اس کا

جواب میں اپنے مبلى سے پوچھ کر دوں گا۔ بحث و مباحثہ کی نشست میں علمائے کرام نے اثبات ختم نبوت اور رد قادریانیت پر سینکڑوں والاکل دیے۔ مرزا قادریانی کی شخصیت کے پرچے اڑائے۔ اصلی قادریانی کتب سے حوالہ جات پیش کیے، لیکن ہر دلیل اور حوالہ کے جواب میں وہ صرف یہ کہتا "میں اپنے مبلى سے پوچھ کر اس کا جواب دوں گا"۔

یوں محسوس ہوتا کہ اس کا ذہن بند کر دیا گیا ہے اور وہ قادریانیت کے علاوہ کچھ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس کی ضد بہت دھرمی اور "میں نہ مانوں" کو دیکھ کر اس کے والدے بحث و مناظرہ بند کر دیے اور اسے جوتے مار کر گھر سے نکال دیا، جائیداد سے عاق کر دیا اور سارے رشتہ داروں نے اس مرتد کا بایکاٹ کر دیا۔

اکبر خان گھر سے نکلا اور سیدھا اپنے یونیورسٹی کے دوست کے پاس ربوہ پہنچا۔ اس نے اسے سینے سے لگایا۔ اکبر خان نے اسے ساری آپ بیتی سنائی۔ اس کے دوست نے محدثی آہیں بھر بھر کر اس کی ساری کمائی سنی۔ اس کی ساری کمائی سننے کے بعد اس کے دوست نے کہا کہ یہ تمہارا امتحان تھا اور تم اس امتحان میں کامیاب و کامران رہے۔ میری طرف سے تمہیں بست بست مبارک ہو۔ تم نے جتنی بھی مصیحتیں برداشت کیں، وہ صرف راہ حق کے لیے تھیں۔ تم نے بن بھائی والدین، عزیز و اقارب گھر پار اور دولت قربان کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ایمان کے سامنے یہ ساری چیزیں یقین ہیں۔

مکار قادریانی کی مکارانہ گفتگو نے فکلت اکبر خان کے جسم میں مضبوطی پیدا کر دی۔ اس کے خوشامدی اور حوصلہ افرا جملوں نے اسے ایک نئی طاقت عطا کر دی۔ قادریانی نوجوان نے اس کے لیے فوری طور پر ربوہ میں دو کمروں والے ایک مکان کا بند و بست کر دیا اور سلسہ روزگار کے لیے ایک پرائیویٹ سکول میں ملازمت دلوادی۔ اس سم کو پورا کرنے کے بعد اس کے پاؤں میں قادریانیت کی بھاری زنجیر ڈالنے کے لیے ربوہ میں ایک قادریانی فیلی میں اس کی ملنگی کر دی گئی اور دو مہینے بعد شادی کا پروگرام طے ہو گیا۔ والدین کے گھر سے نکلنے کے بعد اکبر خان اب اپنا گھر سانے پر بڑا خوش تھا۔ شادی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے قادریانی نوجوان نے اسے سکول سے ایک سال کی ایڈو انس تخریجہ دلوادی۔

اپنی شادی سے ایک مہینہ پہلے اکبر خان شادی کی خریداری کے لیے لاہور آیا۔ لاہور مال روڈ پر اس نے جوتے اور کپڑے خریدنے تھے۔ خریداری کے بعد وہ مال روڈ پر جا رہا تھا۔

جب وہ کتابوں کی مشورہ دکان فیروز سنر کے قریب سے گزر اتو اپنے مطالعاتی ذوق کی وجہ سے وہاں ٹھہر گیا۔ اس نے گھری پر وقت دیکھا تو ابھی ربوہ جانے والی ثرین میں دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ فیروز سنر میں داخل ہو گیا اور ذوق و شوق سے مختلف کتابوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر سیرت النبیؐ کی ایک معروف کتاب "محسن انسانیت" پر پڑی، جس کے مصنف مشور ادیب اور نمذہجی سکالر جناب نعیم صدیقی ہیں۔ اس نے کتاب کو جتنہ جتنہ دیکھا۔ کتاب کے مضامین اسے بڑے پسند آئے۔ اس نے کتاب خرید لی اور ربوبہ روانہ ہو گیا۔ ربوبہ چنچتے ہی اس نے رات کو کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پہلا باب کھولتے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کا تذکرہ اس کی نظروں کے سامنے آیا۔ وہ آقائے دوجاں صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں افراد کے متعلق مندرجہ ذیل طور پر رہا تھا۔

"میں نے جو نبی حضورؐ کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپؐ کا چہرہ ایک جھونٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔" (عبد اللہ بن سلام)

"میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حاضر ہوا تو لوگوں نے دکھایا کہ یہ ہیں خدا کے رسولؐ! دیکھتے ہی میں نے کہا، واقعی یہ اللہ کے نبی ہیں۔" (ابورش تھی)

"طمین رہو،" میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ کبھی تمہارے ساتھ بدمعا ملکی کرنے والا شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا آدمی (اوٹ کی رقم) ادا نہ کرے تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گی۔" (ایک معزز خاتون)

"ہم نے ایسا خوب رو شخص اور نہیں دیکھا..... ہم نے اس کے منہ سے روشنی کی تکلی دیکھی ہے۔" (ابو قرصانہ کی والدہ اور خالہ)

"حضورؐ سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا گویا آفتاب چمک رہا ہے۔" (ابو ہریرہؓ)

"اگر تم حضورؐ کو دیکھتے تو سمجھتے کہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔" (ربیع بنت معوز)

"دیکھنے والا پہلی نظر میں مرعوب ہو جاتا۔" (حضرت علیؓ)

"وہ گورے نکھڑے والا جس کے روئے زیبا کے واسطے سے ابر رحمت کی

دعا میں مانگی جاتی ہیں۔ (ابو طالب)

”میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضورؐ کو دیکھ رہا تھا۔ آپؐ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپؐ کو۔ بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ حضور اکرمؐ چاند سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔“ (حضرت جابر بن سرہ)

”خوشی میں حضورؐ کا چہرہ ایسا چلکنا گویا چاند کا لکڑا ہے۔ اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپؐ کی خوشی کو پہچان جاتے تھے۔“ (کعب بن مالک)

”چہرے پر چاند کی سی چمک تھی۔“ (ہند بن الی ہالہ)

وہ محبوبؐ خدا کے رخ انور کی نیا پاشیوں اور نور افروزیوں کو پڑھ کر جھوم اٹھا۔ اچانک اس کا دھیان مرزا قاریانی کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ میرا مرزا قاریانی بھی کتنا حسین و جیل ہو گا۔ قاریانی ہونے کے باوجود اس نے آج تک مرزا قاریانی کی تصویر نہ دیکھی تھی۔ اس کے دل میں شوق کا ایک طوفان اٹھا کہ مجھے اپنے مرزا صاحب کی تصویر کی ابھی زیارت کرنی چاہیے تاکہ میں ان کے نور افروز چہرے سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر سکوں۔ اس نے کتابوں میں یہ پڑھ رکھا تھا کہ نبی اپنے وقت میں کائنات کے سارے انسانوں سے خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کے شوق نے ایک زبردست انگڑائی لی اور وہ بھاگم بھاگ اپنے قاریانی دوست کے گمراہنگیا اور اس سے بڑی محبت سے مرزا قاریانی کی تصویر کی درخواست کی۔ اس کا دوست اندر رگیا اور ایک بڑے کافند میں مرزا قاریانی کی تصویر لے کر آگیا۔ باہر آتے ہی اس نے اکبر خان سے پوچھا کہ کیا تمہاراوضو ہے؟ کیونکہ بے وضو مرزا صاحب کی تصویر کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔

اکبر خان جھٹ سامنے والی قاریانی عبادت گاہ میں چلا گیا اور وہاں سے وضو کر کے آگیا۔ اس نے اپنے دوست سے مرزا قاریانی کی تصویر لی اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہڑکتے دل کے ساتھ اپنے گمراہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ گمراہنگی تک سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ گمراہ میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی اس نے باہر کا دروازہ بند کر لیا تاکہ کوئی اسے ڈسٹرپ نہ کر سکے اور وہ پورے اشناک کے ساتھ تصویر کی زیارت کر سکے۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور کمرے کی ساری لائیں جلا دیں۔ کانپتے ہاتھوں اور کانپتے دل کے ساتھ اس نے کافند سے مرزا قاریانی

کی تصویر نکالی۔ آنکھوں کے سامنے تصویر آتے ہی اس پر ایک سکتہ ساطاری ہو گیا۔ اس نے پلکیں جھکے بغیر آنکھوں کو تصویر میں گاڑ دیا۔ وہ تصویر میں یوں کھو گیا جیسے وہ تصویر میں سے کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ صاحب تصویر کے اک اک انگ اور اک اک عشماں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سائنس دان خود بین لگائے اپنے تجرباتی عمل کو دیکھ رہا ہو۔ وہ پندرہ منٹ ساکت کھڑا تصویر کی وادی میں گھومتا رہا۔

اس نے دیکھا کہ مرزا قادریانی کی آنکھیں چھوٹی بڑی ہیں، جن میں کوئی روشنی نہیں، کوئی جاذبیت نہیں۔ لمبورا سا سر ہے جس کا عیب چھپانے کے لئے سر پر گزدی یوں باندھ رکھی ہے جیسے گزدی نہیں "انو" ہے۔ ہاتھی کی طرح لکھتے ہوئے لمبے لمبے کان ہیں۔ آنکھیں اتنی چھوٹی ہیں کہ سفیدی اور سیاہی کا امتیاز مشکل ہے۔ بے ڈھب ماتھا کسی پوٹھوہاری علاقے کا منظر پیش کرتا ہے۔ ابرو کے بال یوں غائب ہیں جیسے "بال جھڑ" کا مریض ہو۔ گردن پکھوے کی طرح اندر دیکھی ہوئی۔ خمیری روٹی کی طرح پھولے ہوئے بڑے بڑے ہونٹ۔ پھولے ہوئے نتھنے جیسے کم آسیجن والی ہوا میں سانس لے رہا ہو۔ چکے ہوئے گال اور داڑھی مکڑی کے جالے کا دریانہ منظر پیش کر رہی تھی۔ چہرے پر نہ رعب و بد بہ نہ روشنی نہ ضیاء نہ وجہت نہ ملاحظت نہ شرافت نہ صداقت نہ رعنائی نہ زنبائی نہ جاذبیت نہ آمیت نہ وقار نہ افتخار نہ شوکت نہ تمکنت!۔۔۔ وہ مرزا قادریانی کے چہرے کو دیکھتا رہا۔۔۔ ملاحظہ کرتا رہا۔۔۔ معائنہ کرتا رہا۔۔۔ پڑھتا رہا۔۔۔ اور پھر ایک لمبے سکوت کے بعد وہ زور سے پکارا انھا:

"خدا کی قسم! یہ شکل کسی نبی کی نہیں ہو سکتی۔"

"خدا کی قسم! میں اس سے زیادہ خوبصورت ہوں۔"

"خدا کی قسم! میں نے اس دنیا میں ہزاروں انسان اس سے بہت خوبصورت دیکھے۔"

"اے اللہ! تو گواہ رہنا، میں اس کی شخصیت اور اس کے نہ ہب پر لعنت بھیجا ہوں اور صدق دل سے توبہ کر کے دوبارہ حلقة گوش اسلام ہوتا ہوں۔"

اکبر خان نے اسی رات جلدی جلدی اپنا ضروری سامان بیک میں ڈالا اور پچھے پچھے ریوہ سے بھاگ گلا اور چنیوٹ پہنچ کر اپنے گاؤں جانے والی لاری میں سوار ہو گیا۔ جب لاری نے اسے اس کے گاؤں کی باہر والی سڑک پر اتارا تو رات کے دونج پکے تھے۔ اکبر خان وہاں سے پیدل اپنے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ وہ گاؤں کی طرف جانے والی نسر کے کنارے کنارے ٹل رہا

تحا۔ خوشی سے اس کے پاؤں اچھل اچھل جاتے تھے۔ گاؤں کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا اس کے جسم سے پٹ پٹ جاتی تھی۔ جب ہوا زور سے چلتی تو فضا میں سیٹیاں بنجتے تھیں گویا ہوا سیٹیاں بجا کر اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ یہی ہوا جب درختوں سے گزرتی تو رقص کرتے پڑوں سے ایک عجیب مو سیقی پیدا ہوتی اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے پتے اس کے لیے استقبالی تالیاں بجارتے ہیں۔ اس نے نہر کے پانی کی طرف دیکھا جو چاندنی رات میں چمک رہا تھا اور کبھی کبھی اس سے کوئی لراٹھ کر اسے دوبارہ مسلمان ہونے پر سلاپی پیش کرتی۔ اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھا تو چرخ نیلوفری نے اس کے سر پر ستاروں کے چراغوں کا اہتمام کر رکھا تھا۔ متاثب اپنی چاندنی اس کے قدموں میں لوٹا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جنت کی کسی روشن پر نہر کے کنارے کیسر کر رہا ہے۔ وہ اسی کیف و مسٹی کے عالم میں چلا جا رہا تھا کہ وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ دروازے پر پہنچتے ہی اس نے دستک دی۔ جواب میں اس کے والد صاحب کی آواز آئی:

”کون؟“

”میں، اکبر خان۔“

”تمہارے لیے اس گھر کے دروازے ہیئت کے لیے بند ہو چکے ہیں اور تم میرے لیے مر چکے ہو۔“ اس کے والد صاحب نے غصہ میں جواب دیا۔
”ابا جی! میں آپ کے لیے دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔ میں قادریت سے تائب ہو کر مسلمان ہو چکا ہوں۔“

کھڑاک سے دروازہ کھلا اور باپ نے اپنے لخت جگر کو اپنی بانسوں میں لے لیا۔ دونوں جانب سے ہپکیوں کی صدا اٹھی اور دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشے بہ نکلے۔ ہپکیوں اور سکیوں کی صدائے سارا گھر جاگ اٹھا اور سارے اہل خانہ یہ عظیم خوشخبری سنتے ہی وار نتھی کے عالم میں اکبر خان سے پٹ کئے۔ خوشی کے آنسوؤں سے ہر چڑہ چمک اٹھا۔ اہل خانہ نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اپنے سر بجدے میں رکھا دیے۔

پھر سب گھروالوں نے اکبر خان کو کرسی پر بخایا اور خود اس کے ارد گرد بیٹھ گئے اور اس سے اس ایمانی انقلاب کی رواداد پوچھنے لگے۔ اکبر خان نے انہیں بالتفصیل ساری کمالی سنائی اور پھر جیب سے مرزا قادری کی تصویر نکال کر دکھائی۔ سب جوش و غصب سے تصویر پر

تموکنے لگے، جوتے مارنے لگے۔ اکبر خاں نے فوراً تصویر ان سے لے لی کیونکہ صحیح گاؤں والوں کو بھی تصویر دکھانا تھی۔ اکبر خاں نے سارے اہل خانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "مرزا قادیانی کے جھوٹا ہونے کی سب سے بڑی دلیل اس کی شکل ہے۔ کاش قادیانی عقل سے اس کی شکل دیکھیں تو دو منٹ میں فیصلہ ہو جاتا ہے"۔

صحیح گاؤں میں زبردست جشن منایا گیا۔ اکبر خاں کو ہاروں سے لاد کر پورے گاؤں کا راؤنڈ لگایا گیا۔ سینکڑوں دیگریں پکائی گئیں۔ پورے گاؤں میں خوشی سے زبردست ہواں فارنگ ہو رہی تھی اور ہر گولی قادیانیت کے لائے کے پر نچے اڑا رہی تھی۔





علیٰ محبہ ساتھ فاطمہ زینب پورہ

تکانی صاحب خلیفہ شیعہ بورہ فوت 2329

وہ نوکری کی تلاش میں اس طرح پھر تارہا جیسے ابن بطورہ سیاحت کے شوق میں۔ پاکستان میں شاید ہی کوئی محکمہ ایسا ہو، جہاں اس نے نوکری کے لیے درخواست نہ دی ہو۔ اس نے نوکری کے لیے جو درخواستیں دی تھیں، اگر ان درخواستوں کو انکھا کیا جاتا اور ان کا وزن کیا جاتا تو درخواستوں کا مجموعی وزن اس کے اپنے وزن سے زیاد ہوتا۔ نوکری کی تلاش میں اس کے جو تے اور دماغ دو نوں گھسنے پڑتے تھے اور اس کی سوچ پڑ پھلی تھی۔ جہاں نوکری کا اشتمار آتا، وہ نوکری کے نیچے یوں بھاگتا، جیسے ملی چوہے کے نیچے بھاگتی ہے لیکن یہی شے نوکری کا چوہا اسے جلدے کر بھاگ جاتا۔ نوکری کی نیلم پری تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس رشوت اور سفارش کے ظہماتی چراغ نہیں تھے۔ وہ نوکری کی درخواست دینے کے بعد نوکری کا انتظار یوں کرتا، جیسے کوئی مشرقی شاعر اپنے محبوب کا انتظار کرتا ہے۔ نوکری کے انگور اونچے ہونے کے باوجود وہ لوڑی کی طرح انگوروں پر بچھتا رہا لیکن بار بار کی ناکامی کے باوجود اس نے کبھی بھی انگوروں کو کھانا کہا۔

ایک دن اس نے اخبار میں اشتمار پڑھا کہ واپڈا میں اسٹنٹ کی آسامیاں خالی ہیں۔ اس نے جھٹ درخواست لکھی اور درخواست دینے کے لیے چل پڑا۔ راستے میں اسے اس کا بے تکلف دوست مقبول ملا، جو اس کا کلاس فیلو بھی تھا اور ایک بینک میں ملازم تھا۔ اس نے اس سے پوچھا کہ ”منیر حسین کماں جا رہے ہو؟“ اس نے جواب دیا کہ ”نوکری کے لیے واپڈا میں درخواست دینے جا رہوں۔“ اس کے دوست مقبول نے بھی اذبار میں وہ اشتمار پڑھا تھا۔ اس نے اس سے کہا کہ ”درخواست دینے کے بعد شام کو میرے پاس گھر آنا۔ میں نے تم سے ایک انتہائی ضروری بات کہنی ہے۔“ وہ شام کو مقبول کے گھر پہنچ گیا۔ مقبول نے اسے کہا کہ ”تمہیں میری طرف سے پیشگی مبارک ہو کہ تمہیں نوکری مل چکی ہے۔“

”کیسے؟“ منیر حسین نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔“ مقبول نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

مقبول نے پھر چیلنج کے انداز میں زور سے کہا کہ ”اگر تمہیں نوکری نہ ملی تو میرا گریبان اور تمہارا ہاتھ ہو گا۔“ اس کے ساتھ ہی مقبول اپنے ڈرائیک روم سے انھا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی پلیٹ تھی۔ اس نے منیر حسین سے کہا کہ ”میری طرف سے ابھی منہ بیٹھا کر لو۔“ منیر حسین اس سے حیرت سے پوچھتا رہ گیا لیکن

مقبول نے نہ ہتایا۔ وہ صرف یہ کہتا رہا کہ ”ایک بہت بڑا راز ہے اور میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔ ہاں جس دن تمہارا انٹرviو ہو گا، اس سے ایک دن قبل شام کو تم میرے پاس ضرور آنا۔ میں تمہیں ساری بات بالتفصیل بتا دوں گا۔“ اس کے بعد مقبول نے اسے زبردستی مٹھائی کھلا دی۔ مٹھائی کی لذت اور خوبصورتی کے دل میں اتراتر کر اسے بتا رہی تھی کہ ”تمہاری نوکری کپکی ہو چکی۔ اب تم گھوڑے پیچ کر سو جاؤ۔“

اس بات کو تھوڑے ہی دن بیتے تھے کہ اسے انٹرviو کے لیے کال آگئی اور وہ انٹرviو کی تاریخ کا یوں انتظار کرنے لگا، جیسے ماں سکول سے لیٹ ہوئے بچے کا انتظار کرتی ہے۔ خدا خدا کر کے وہ دن آیا، جس کی صبح اس کا انٹرviو تھا۔ وہ شام کو اپنے دوست مقبول کے گھر اس تیزی سے پہنچا، جیسے وہ 16-F ہو۔ اس نے مقبول کے گھر کی گھٹھی بھجائی۔ مقبول مسکراتا ہوا ہاہر آیا اور اسے سینے سے لگایا۔ اسے ڈرائیگ روم میں بھجا یا۔ مقبول نے اس سے کہا:

”میرے پیارے دوست! میری گفتگو اس خاموشی سے سنو، جس طرح رات کا سناٹا ستاروں کی کتھاہ کو سنتا ہے اور میری گفتگو کا ایک ایک جملہ اپنے ذہن میں محفوظ کرتے جاؤ۔ کل جماں تمہیں انٹرviو کے لیے جانا ہے، وہاں کا ڈائریکٹر، جس نے آدمی بھرتی کرنے ہیں، وہ قادریاً ہے۔ اس کارنگ سیاہی ماکل اور چہرے کے نقوش اس اس طرح کے ہیں۔ جب تم انٹرviو کے کمرے میں داخل ہونا تو سب سے پہلے میری ہتاہی ہوئی نشانیوں کے مطابق اس ڈائریکٹر کو پہنچان لینا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت مسکراہٹ اس ڈائریکٹر کی طرف پھینکنا تاکہ وہ تمہاری جانب متوجہ ہو سکے۔ قادریاں کی ایک مخصوص نشانی ان کی ایک مخصوص انگوٹھی ہوتی ہے جس پر ”لیس اللہ بکاف عبدہ“ لکھا ہوتا ہے۔ تم وہ انگوٹھی ہاتھ میں پھن کر جانا۔ جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو تو تجھے سوالوں کے جواب آتے ہوں، دیتے جانا لیکن اپنی انگوٹھی ڈائریکٹر کے سامنے کر کے انگوٹھی کو گھماتے رہنا۔ انٹرviو کے بعد جب وہاں سے اخبوگے تو پھر ایک لطیف سی مسکراہٹ ڈائریکٹر کی طرف پھینکنا۔۔۔ بس تمہاری نوکری کپکی۔“

لیکن پار مقبول! میں یہ انگوٹھی کہاں سے لاوں؟“ منیر حسین نے پوچھا۔

”تو پیارے یہ کام بھی میں کر آیا ہوں۔“ مقبول نے انگوٹھی جیب سے نکال کر منیر حسین

کو دکھاتے ہوئے کہا۔

منیر حسین بہت خوش ہوا اور وہ مقبول کا زبردست شکریہ ادا کرتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر جاتے ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اندر سے دروازہ بند کر کے آئینہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے عمل کی ریہر سل کرنے لگا۔ اس نے سب سے پہلے آئینہ میں دیکھتے ہوئے ایک مسکراہٹ پھینکی۔ گویا ڈائریکٹر آئینہ میں بیٹھا ہے۔ پھر وہ قصور میں ڈائریکٹر کے سامنے بیٹھا سوال و جواب کے ساتھ انگوٹھی گھمانے کی مشق کرتا رہا۔ کبھی وہ انٹرویو والے کمرے میں داخل ہونے کی ریہر سل کرتا، کبھی کمرے سے باہر نکلنے کی۔ کبھی مسکرانے کی اور کبھی انگوٹھی گھمانے کی اور پھر سارے کام کرنے کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔

آخر خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اس نے خوبصورت کپڑے پہنے اور انٹرویو کے لیے روانہ ہو گیا۔ دفتر میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہاں سینکڑوں امیدواروں کا اٹوڈھام تھا۔ امیدواروں کا اتنا بڑا مجمع دیکھ کر وہ مایوس ہو گیا لیکن انگوٹھی کو دیکھ کر مسکرا پڑا۔ انٹرویو شروع ہوا تو وہ اپنی باری کا یوں انتظار کرنے لگا، جیسے ڈاکٹر کے کمرے سے باہر لائیں میں لگے مریض اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔۔۔

جب اس کی باری آئی تو اس کا نام پکارا گیا۔۔۔ وہ پھر تی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سید ہی اس کی نظر ڈائریکٹر پر پڑی، جسے اس نے مقبول کی بتائی ہوئی نشانیوں کی مدد سے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ ڈائریکٹر کے ساتھ انٹرویو پیئنل میں دوسرے بھی افسران بیٹھے تھے۔ اس نے جاتے ہی ڈائریکٹر کی طرف ایک خوبصورت سی مسکراہٹ پھینکی۔ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ جواب دینے سے قبل اس نے اپنا ہاتھ ڈائریکٹر کے عین سامنے رکھا اور ہاتھ کی انگلی ڈائریکٹر کے عین سامنے رکھتے ہوئے انگوٹھی کو گھماانا شروع کر دیا۔ ڈائریکٹر بار بار ترجمی لگا ہوں سے انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔ انٹرویو پیئنل میں شامل افسران میں سے ڈائریکٹر نے اس سے سب سے آسان سوال پوچھے۔ جب وہ سوال و جواب کی نشست سے فارغ ہو چکا تو ہاہر جاتے ہوئے اس نے ڈائریکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ دی۔ جواب ایسا ڈائریکٹر کی طرف سے بھی مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا تو اندر سینے میں بیٹھا دل پکار رہا تھا کہ ”چل میاں منیر حسین! تیرا کام پکا ہوا۔“ وہ از حد خوش تھا کہ وہ اپنی مسم میں کامیاب رہا ہے اور اس نے غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

وہ روزانہ گھر کے دروازے پر کھڑا ہو کر ڈائیکے کا یوں انتظار کرتا، جیسے مجنون لیلی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ ایک سہ پہڑا کیا آیا اور خط پھینک کے چلا گیا لیکن وہ تو اس وقت خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ ڈائیکے کے آئے کا وقت گزر چکا ہے لیکن پھر بھی اس نے سوچا کہ چلو بہر دیکھی ہی لیتے ہیں۔ جو نبی وہ باہر نکلنے کا تو ہاہر والے دروازے کے پیچے اس کو ایک لفافہ پر انظر آیا۔ وہ چیتے کی پھرتی سے لفافے پر جھٹتا۔ جب لفافہ کھولا تو خوشی سے اس کا دل دھک کامیوزک بجانے لگا اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں بریک ڈائیس کرنے لگیں۔ وہ اسٹنٹ بھرتی ہو چکا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا، اس لیے وہ ہمارا لیٹر کو پڑھ رہا تھا۔

منیر حسین خوشی سے دوستوں اور محلے داروں میں محلی تقسیم کر رہا تھا۔ محلے دار بھی حیران تھے کہ یہ فرہاد کیسے جوئے شیر لے آیا؟ محلی بانٹنے کے بعد وہ بھاگم بھاگ اپنے دوست مقبول کے گھر گیا اور جاتے ہی اس کے گلے کا ہار بن گیا۔ دونوں نے کامیابی پر جی بھر کے قبیلے اگلے دن منیر حسین اپنی ڈیوٹی پر حاضر تھا۔ اس کی کرسی میز اس کا انتظار کر رہی تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ انتظار کی گھروں کا خاتر کر کے کرسی پر جلوہ افروز تھا۔ جس دن وہ نوکری پر حاضر ہوا، یہ سال کا پہلا مہینہ تھا اور مینے کی پہلی تاریخ تھی اور اس کا دفتر میں پہلا دن تھا۔ وہ ان اتفاقات پر بڑا حیران اور خوش تھا۔ جلد ہی وہ دفتر کے ماحول میں رج بس گیا۔ نہ مکھ اور مزاجیہ طبیعت ہونے کی وجہ سے چند دنوں میں دفتر میں اس کے سینکڑوں دوست بن چکے تھے۔

مینے کے بعد جو پہلی تاریخ آئی تو وہ بہت پر مسرت تھا کہ آج اسے تنخواہ ملنی ہے۔ تقریباً بارہ بجے اس نے تنخواہ وصول کی اور نوٹوں کو اچھی طرح گھن کے اس حفاظت سے شلووار کی اندر والی جیب میں رکھ لیا جیسے کوئی مصور اپنے شپاروں کی حفاظت کرتا ہے۔ گھری نے شن کر کے ایک بجا یا ہی تھا کہ مذکورہ بالا ڈائریکٹر کا چڑپا اسی اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ آپ کو صاحب یاد کر رہے ہیں۔ اس نے اپنا لباس درست کیا، بالوں میں سکھا کیا اور ڈائریکٹر کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ڈائریکٹر کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ جواب میں ڈائریکٹر بھی خوب مسکرا یا۔ ڈائریکٹر اپنی سیٹ سے اٹھا اور اس سے مصافحہ کرتے ہوئے سینے سے لگالیا اور پھر اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھٹ کرسی پر براجماں ہو گیا۔ ”نوکری کی مبارک ہو۔“ ڈائریکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سب کچھ آپ کی بدولت ہوا ہے۔“ منیر حسین نے جواب دیا۔
”پہلی تنوہ مبارک ہو۔“

”آپ ہی تمام مبارک باروں کے مستحق ہیں۔“

”وفتر میں دل لگ گیا؟“

”جی ہاں! سب بہت اچھے لوگ ہیں۔“

پھر ڈاکٹر کشہر نے کہا:

”میں نے آپ کا تعارف اس دفتر میں تعمیمات اپنی جماعت کے لوگوں سے کرنا تھا لیکن مصروفیات کی وجہ سے نہ کرو سکا۔ ہم جماعت کے تمام لوگ میں میں ایک دن کسی دوست کے گمراختے ہوتے ہیں اور ایک زبردست مینگ کرتے ہیں، جس میں دفتر کی صورت حال پر تفصیلی غور کیا جاتا ہے۔ آپ کو بھی آئندہ مینگ میں ضرور بلا کیں گے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ اس دفتر میں ملازم اپنی جماعت کا ہر فرد اپنی تنوہ کا ایک حصہ منقص کر کے بطور چندہ برائے جماعت مجھے دیتا ہے اور میں وہ ساری رقم اکٹھی کر کے ربوہ بھیج دیتا ہوں۔ خلیفہ صاحب میری کارکردگی سے بہت خوش ہیں اور میرے پاس ان کے ترقیٰ مخطوط موجود ہیں۔“

پھر ڈاکٹر کشہر نے مسکراتے ہوئے منیر حسین سے کہا:

”لائیے آپ بھی حضرت مسیح موعود کی جماعت کے لیے اپنا چندہ دیجئے۔“

”کون سے حضرت مسیح موعود؟“ منیر حسین نے پوچھا۔

”بھی حضرت مسیح موعود مرزا غلام احمد قادریانی صاحب۔“ ڈاکٹر کشہر نے کہا۔

”ہم اس جھوٹے نبی پر لعنت بھیجتے ہیں۔“

”کیا کما آپ نے!۔“

”درست کہا میں نے۔“

”کیا آپ ہوش میں ہیں؟“

”جی ہاں! میں ہوش میں ہوں اور ایمان کی بہترین حالت میں ہوں۔“

”کیا آپ قادریانی نہیں ہیں؟“

”میں قادریانیوں پر لعنت بھیجا ہوں۔“

”تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“

”تم نے اللہ، رسول، قرآن اور ملت اسلامیہ کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“

”میں ابھی تمہارا بندوبست کرتا ہوں۔“

”تم میرا بندوبست کیا کرو گے۔ اب تمہارا بندوبست میں کروں گا۔“

جو شہ میں آیا ہوا منیر حسین اپنی گرج دار آواز میں کہنے لگا:

”میں اس ادارے میں تمہاری سازشوں کو طشت از بام کروں گا۔۔۔

تمہارے چروں کو بے نقاب کروں گا۔۔۔ تمہارے پوشیدہ جرام کو ننگا کروں

گا۔۔۔ اس ادارے میں پھیلائے ہوئے تمہارے جال کے ایک ایک دھاگے کو

توڑ دوں گا۔۔۔ یہ ملک ہمارا ہے۔۔۔ اسے ہمارے اسلاف نے ہنگ و خون کا

سمندر عبور کر کے حاصل کیا تھا۔۔۔ اس کی فناوں میں ہمارے شہیدوں کے

خون کی خوشبو رچی بسی ہے۔۔۔ یہ ملک ہمارے آقا جناب محمد علی صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے نام پر بناتھا۔۔۔ اس ملک کے ہم وارث ہیں۔۔۔ اس کے سارے

وسائل ہمارے لیے ہیں۔۔۔ تم ملت اسلامیہ کے ندار ہو۔۔۔ تم انگریزوں کے

ٹاؤٹ ہو۔۔۔ تم امریکہ کے جاسوس ہو۔۔۔ تم بھارت کے کارندے ہو۔۔۔ تم

اسرائیل کے ایجنت ہو۔۔۔ تم برطانیہ کی پیداوار ہو۔۔۔ تم نے ایک گھناؤنی

سازش کے تحت اس ملک کی کلیدی آسامیوں پر قبضہ کیا۔۔۔ اس کے بعد اپنی قوم

کے رذیل افراد کو مختلف اداروں میں بھرتے رہے اور پھر پاکستان پر حکومت کرنے

کے خواب دیکھتے رہے۔۔۔ میں اس دفتر میں تمہاری آنکھوں میں کانٹا اور دل میں

انگارہ بن کے رہوں گا۔۔۔

پھر منیر حسین غصہ میں بولتا ہوا جوتے تذاخ تذاخ زمین پر مارتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔۔۔ اور ڈائریکٹریوں محسوس کر رہا تھا کہ یہ جوتے تذاخ تذاخ اس کے سر پر پڑ رہے ہیں۔۔۔!!!





عَالِمٌ مُبْلِسٌ لَا تَحْفَظْ فَتَنْبُوْشْ
تَكَانْتْ صَاحِبْ مُخْلِصٌ شَيْخُوْهُوْرَكْ دُوكْ

2329

میری پیاری ماں! میری سوچیں مجھے میرے ماضی کی طرف کھینچنے لئے جا رہی ہیں اور میرے ذہن میں موجود مااضی کی ویژیو کیسٹ نے چلنا شروع کر دیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میں ایک چھوٹا سا پچھہ ہوں، جو گمراکے محن اور کروں میں شرار تھیں کرتا بھاگتا پھر رہا ہے۔ بھاگتے بھاگتے جب کبھی مجھے ٹھوکر لگتی ہے تو میں گر جاتا ہوں اور میرے روئے کی آواز سے آپ کے سینے میں اک تیر سالگرا ہے اور آپ باڑ کی سی بھتی سے مجھ پر چھپتی ہیں اور مجھے اخاکر سینے سے لگاتی ہیں اور مجھے اتنا جی بھر کر پیار کرتی ہیں کہ میرے رخساروں پر آپ کے ہونٹوں کے نشانات ٹہت ہو جاتے ہیں اور میں آپ کی گود میں انکھیلیاں کر رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ سیب کی قاشیں کر کے مجھے کھلا رہی ہیں۔ سیب میں کھا رہا ہوں، لیکن سرفی آپ کے چہرے پر آرہی ہے۔ میں ملاحظہ کر رہا ہوں کہ آپ مجھے نہ لارہی ہیں، خوبصورت کپڑے پہن رہی ہیں، بالوں میں سکنگی کر رہی ہیں، چہرے پر پوڑر لگا رہی ہیں اور پھر مجھے محبت سے دیکھ کر فرط جذبات سے سینے سے چھٹا رہی ہیں۔ جب میں بولنے کے قابل ہوا تو آپ نے سب سے پہلے مجھے کلمہ طیبہ سکھایا اور پھر بسم اللہ یاد کرائی۔ جب میں اپنی توتلی زبان سے آپ کو کلمہ طیبہ پڑھ کر ناتا تو آپ خوشی سے پھولے نہ ساتیں۔ جب میں سکول جانے کے قابل ہوا تو آپ نے مجھے اپنے علاقے کے بہترین سکول میں داخل کرایا۔ جب میں گلے میں بستہ ڈالے سکول کو روانہ ہوتا تو آپ مجھ پر درود شریف کا دم کرتیں۔ میں سکول چلا جاتا تو میرے بغیر گمراہیں آپ کا جی نہ گلتا۔ اگر میں کبھی سکول سے لیٹ ہو جاتا تو آپ کی آنکھیں میرے رستے میں گڑی ہوتیں اور جونہی میں آپ کے سامنے آتا تو آپ کی آنکھوں میں خوشی سے تارے جمللا۔ لگتے۔ آپ مجھے کبھی اپنی آنکھوں سے او جمل نہ ہوئے دیتیں۔ گلی محلے میں کھینٹنے کے لئے کبھی نہ جانے دیتیں۔ میں جب کبھی پیار ہو جاتا تو آپ شدید پریشان ہو جاتیں، مگر کاسارا نظام تلپٹ ہو جاتا۔ آپ میرے سرما نے ساری ساری رات جاگتیں اور آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر مجھ پر دم کرتیں۔

والدہ محترمہ! جب میری عمر دس سال ہوئی تو ابا جان داعی مفارقت دے گئے۔ ہماری خونگوار زندگی پر بلا میں نوث پڑیں۔ رشتے داروں نے آنکھیں پھیر لیں، اپنے

بیگانے ہو گئے لیکن آپ نے مجھے کبھی بھی تیبی کا احساس نہ ہونے دیا۔ آپ صاحب کرم بن کر میرے سر پر چھائی رہیں۔ آپ نے مجھے ماں کی متاتا کے ساتھ ساتھ باپ کی شفقت بھی عنایت کی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اب ابھی کی وفات کے وقت ہمارا کل اٹاٹہ رہائشی مکان اور والد صاحب کی چھوڑی ہوتی تھوڑی سی رقم تھی۔ جب رشتہ داروں نے آپ سے کہا کہ آپ مجھے سکول سے اٹھالیں اور کسی کام پر ڈال دیں، کیونکہ آپ کے پاس مجھے تعلیم دلانے کے لئے رقم نہ تھی لیکن آپ کا جرنیلی حوصلہ رشتہ داروں کے سامنے سُنگاخ چنان بن گیا اور آپ نے رشتہ داروں کو دو ٹوک جواب میں کہا تھا "میں لوگوں کے گمراوں میں محنت مشقت کرلوں گی لیکن اپنے بچے کو زیور تعلیم سے ضرور آہستہ کروں گی"۔

یہ آپ کے عزمِ محکم کے باعث تھا کہ میں میزک، ایف۔ اے اور بی۔ اے میں فرشت ڈویڈن حاصل کرتا رہا۔ جب بھی میرا رزلٹ آتا تو آپ کے چہرے پر ایک فاتح کی مسکراہٹ ہوتی اور اس تعلیم مسکراہٹ سے میرے اندر ایک نیا حوصلہ اور ولولہ پیدا ہوتا۔

ام محترمہ! امتیازی حیثیت سے بی اے کرنے کے بعد جب مجھے ایم بی اے کرنے کے لیے امریکہ جانا پڑا تو یہ وقت آپ کے لیے بڑے امتحان کا وقت تھا۔ میں آپ کا اکلوتا بیٹا، جو آپ کی آنکھوں کی پینائی تھا، جس کو دیکھے بغیر آپ ایک دن نہ گزار سکتی تھیں، وہ ایک لمبی مدت کے لیے آپ سے ہزاروں میل دور جا رہا تھا۔ آپ کے آہنی عزم کو سلام کر آپ نے اپنی محبت پر میری تعلیم کو فوکیت دی۔ آپ نے اپنے زیورات اور گمراہ کی تیبی اشیاء پہنچ کر میرے داخلہ اور سڑو غیرہ کے اخراجات کا بندوبست کیا۔

ماور شیق! ہبہون ملک میری تعلیم کا بندوبست ہونے کے بعد یہ مسئلہ درپیش تھا کہ میرے چلے جانے کے بعد آپ پاکستان میں کس کے پاس رہیں گی۔ کسی رشتہ دار کے پاس رہنا آپ کی غیور طبیعت کو گوارہ نہ تھا اور میرے ساتھ امریکہ چلے جانا ہمارے بس میں نہ تھا۔ ہم دلوں اسی مسئلہ کے حل میں سرگروں تھے کہ آپ نے ہی تجویز پیش کی تھی کہ میرا دوست مسعود احمد ہو پہلی جماعت سے بی اے نک میرا

کلاس فیلو اور جگری بار تھا، اس کا اور اس کے گروالوں کا بڑی دیر سے ہمارے گمرا آنا جانا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ والی گلی میں کرانے کے مکان میں رہتے تھے۔ آپ نے کہا تھا کہ ہمارے پاس تین کمرے ہیں اور ایک بڑا صحن ہے۔ میں اکیلی اتنے بڑے گمر کو کپا کر دیں گی۔ تم سامنے والے دو کمرے اور مشترکہ صحن اپنے دوست کو کرانے پر دے دو۔ کوئے والے ایک کمرے میں، میں رہائش رکھ لولں گی۔ مسعود احمد کی ماں میری بُن بُنی ہوئی ہے اور اس کے بچے مجھے تیری طرح ہیں۔ ان کے ہمایاں رہنے سے گمر میں رونق بھی رہے گی اور تمہاری جدائی کا فلم بھی ہلکا رہے گا۔ ان سے جو کرایہ مکان ملے گا، اس سے میری گزر ببر ہوتی رہے گی اور تم میرے اخراجات سے بے گفر ہو کر تعلیم حاصل کر سکو گے۔ میں نے آپ کی تجویز کو فوراً مان لیا تھا اور اسی وقت بھائیم بھاگ مسعود کے گمرا کیا تھا اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی۔ اس نے مجھے فوراً اندر بلا لیا تھا اور میری موجودگی میں اپنی والدہ اور والد کے سامنے آپ کی تجویز رکھی تھی۔ وہ سب آپ کی بات سے متفق تھے اور بہت زیادہ خوش تھے۔ مسعود احمد اور اس کے گروالے میری امریکہ روائی سے قبل ہمارے ہاں منتقل ہو گئے تھے اور آپ کی طبیعت ان میں تحمل مل گئی تھی اور میں اس صورت حال سے بہت خوش تھا۔

پھر وہ وقت آگیا جب آپ مجھے امریکہ جانے کے لیے ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئی تھیں اور انتہائی حوصلہ اور ضبط کے باوجود آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھینم گر رہی تھی اور آپ نے مجھے اپنی دعاوں کی چھاؤں میں امریکہ روانہ کیا تھا۔

ای جان! میں امریکہ پہنچ کر اپنی پڑھائی میں معروف ہو گیا لیکن ایک لمحہ بھی آپ کو نہ بلا سکا۔ ہر وقت آپ کا رخشیدہ رخشیدہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ میں ہر پندرہ دن بعد آپ کو خلط لکھتا رہتا اور جو اب آپ کے خلط بھی آتے رہتے اور ہم ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہوتے رہتے۔ آپ کی طرف سے مجھے ہیش آپ کی خوشی اور خیریت کی اطلاع ملتی۔ تقریباً اڑھائی سال آپ کی اور میری خلط و کتابت جاری رہی۔ امریکہ سے ایم بی اے کرنے کے بعد جب میں نے آپ کو اپنی کامیابی کی نوید سناتے ہوئے خلط لکھا تو آپ کا ڈیروں مبارک باروں اور دعاوں سے

ببرا جوابی خط طا' نے پڑھ کر میں خوشی سے آبدیدہ ہو گیا۔ پھر میں نے آپ کو اپنی پاکستان والی کا خط لکھا اور بتایا کہ میں فلاں تاریخ کو پاکستان بخوبی رہا ہوں تو آپ نے مجھے جواباً انتہائی مرتب انگیز خط لکھا تھا کہ بیٹا! میں تمہارے استقبال کے لئے ایئرپورٹ پر موجود ہوں گی لیکن کل جب میں پاکستان آیا تو میری آنکھیں آپ کی تلاش میں تھیں لیکن مجھے وہاں کمیں بھی آپ کا وجود نظر نہ آیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا دوست مسعود احمد ایئرپورٹ پر ایک کونے میں کھڑا ہے اور وہ مجھے لینے کے لئے آیا ہوا ہے۔ میں مسعود سے پڑے پتاک سے طا اور اس سے فوراً آپ کی پابت پوچھا کہ آپ تشریف کیوں نہیں لائیں؟ لیکن وہ ادھراً درکی ہاتھیں چھیڑ کر مجھے اپنی ہاتوں میں لگاتا رہا۔ پھر جب میں نے زور دے کر آپ کے متعلق پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس سوال کا جواب گمراہ کر دے گا۔ اس کا یہ جواب سن کر میرا پورا وجود تھرا اٹھا اور میں پہنچی پہنچی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ خیریت نہیں۔

گمراہ پہنچا تو اس کے سارے گمراہیے ملئے کے لیے گمراہ کے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ لیکن ای جان! وہاں آپ کا چہرہ نہیں تھا۔ گمراہ میں بیٹھنے کے بعد میں نے فوراً ان سے پوچھا کہ میری ای جان کماں ہیں؟ تو انہوں نے مجھے یہ بتا کر میرے پاؤں تلنے سے زمین نکال دی کہ آپ کو فوت ہوئے چہ ماہ گزر گئے ہیں۔ آپ کی موت کی خبر سن کر میرے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ میرا بھی چاہتا تھا کہ میں ایم بی اے کی اس ڈگری کو ٹک کر دیا جس نے مجھے میری ماں کا چہرہ نہ دیکھنے دیا۔ مسعود احمد اور اس کے گمراہیے ملئے تسلیاں دیتے رہے لیکن میرے بمحروم دل کو تسکین کماں ملتی تھی۔ میں نے مسعود کے گمراہوں سے پوچھا کہ تم نے مجھے میری والد کے فوت ہوئے کی اطلاع کیوں نہ دی؟ جس کا جواب صرف خاموشی تھا۔ میں نے روئے ہوئے مسعود احمد سے کہا کہ مجھے میری ای جان کی قبر پر لے چلو۔ اس پر وہ سارے گمراہیے پھر خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے فحصہ سے پوچھا ”تھاڈ کماں دفن ہے میری ماں؟“ تو مسعود نے جواب دیا کہ وہ ”ریوہ“ میں دفن

"وہ اپنی خواہش کے مطابق وہاں دفن ہوئی ہیں" مسعود نے جواب دیا۔
 "یہ کیسی خواہش؟"
 "بیس ان کی مرضی۔"

"ریوہ میں تو قادریانی دفن ہوتے ہیں" میں نے کہا۔
 "امنوبوں نے بھی قادریانی نمہب قبول کر لیا تھا" مسعود نے جواب دیا۔
 "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا" میں نے لکھا کر کہا۔

"یہ دیکھنے پاٹا ٹھوٹ" مسعود نے مجھے آپ کے قادریانی ہونے پر آپ کا بیعت فارم دکھاتے ہوئے کہا اور پھر اس نے ریوہ میں دفن ہونے کی آپ کی دیست بھی دکھائی۔
 "کس محدود کی تبلیغ سے میری ماں قادریانی ہوئی" میں نے غصہ میں کانپتے ہوئے کہا۔

"ہماری تبلیغ سے" مسعود نے قاتحانہ انداز میں آنکھوں میں مگراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تم قادریانی ہو؟" میں نے غصباک ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہم قادریانی ہیں" مسعود نے سینہ تان کر جواب دیا۔

"تم نے میرے ساتھ زندگی کے چھدرہ سال گزارے لیکن تم نے آج تک مجھے یا کسی دوست کو نہیں بتایا کہ تم قادریانی ہو۔"

"اگر ہتا دیں تو تم میں مل کر کیسے رہیں؟ تمہیں اپنے جاں میں کیسے پہنچائیں؟ اور ایسی مہموں میں کامیاب کیسے ہوں؟" مسعود نے میرے زغمبوں پر نمک چڑھکتے ہوئے کہا۔ قریب تھا کہ مسعود اور مجھے میں ہاتھا پائی ہو جاتی کہ اس کا چھوٹا بھائی محمود مجھے پکڑ کر باہر لے گیا۔ محمود ان میں سے کچھ کمرا اور صاف طبیعت کا مالک ہے اور ان دونوں اس کے اپنے گمراہوں سے کسی مسئلہ پر شدید اختلافات ہیں۔
 ماں جی! محمود نے مجھے بتایا۔

"تمہارے امریکہ چلے جانے کے بعد اس کے گمراہوں نے تمہاری والدہ کی خوب خدمت نہیں۔ انہیں کبھی علیحدہ کھانا نہ پکانے دیا، میں وقت پر انہیں چارپائی پر کھانا پہنچایا جاتا۔ میری بہنس تھماری والدہ کے کپڑے دھوتیں، سر میں تمل ڈال کر

ماش کرتیں، رات کو روزانہ سونے سے قبل پاؤں دباتیں۔ اس طرح کی خدمت کر کے ہمارے گروالوں نے تمہاری والدہ کو اپنے اخلاق کے شیئے میں اتار لیا اور پھر آہستہ آہستہ انہیں قادریائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ ان پڑھ ہوئے کے ناطے وہ سمجھتیں کہ قادریانی بھی مسلمانوں کا ایک طبقہ ہیں۔ جس طرح مختلف ممالک کے آپس میں اختلافات ہیں، ایسے ہی اختلافات دوسرے ممالک اور قادریانیوں کے مابین ہیں۔ پھر انہیں یہ بتایا گیا کہ تمہارا بیٹا سلیم بھی قادریانی ہو چکا ہے اور ہمارے گروالوں نے تمہاری والدہ کو تمہارا خط دکھالا، جس میں تم نے لکھا تھا کہ تم قادریانی ہو چکے ہو اور تم نے اپنی والدہ کو کہا تھا کہ قادریانی ہی سب سے بہتر مسلمان ہیں۔ اس خط میں تم نے اپنی والدہ کو تاکید کی تھی کہ وہ بھی فوراً قادریانی ہو جائیں۔

میری بیماری ماں! محمود نے مجھے بتایا۔

”جب امریکہ سے تمہارا خط آتا تو ہمارے گروالے تمہاری والدہ کو اپنی مرضی کا فرضی خط سنادیتے اور تمہیں تمہاری والدہ کی خوبیت کا خط لکھ دیتے۔ تمہیں تمہاری والدہ کے جتنے بھی خطوط ملے، وہ جعلی تھے۔ ایک سال کی تبلیغ کے بعد تمہاری والدہ قادریانی ہو گئی۔ ان کے قادریانی ہوئے پر ہمارے گروالوں نے انہیں پھر تمہارا جعلی خط سنایا، جس میں تم نے اپنی ماں کو قادریانی ہوئے پر ہزاروں مبارک بادیں دی تھیں اور اسے اللہ کا بہت بڑا انعام لکھا تھا، جسے پڑھ کر تمہاری والدہ ازحد خوش ہوئی تھیں۔ پھر تمہاری والدہ اکثر قادریانی تقریبات میں آنے جانے لگیں۔ وہ کئی مرتبہ رودہ بھی گئیں اور پھر انہوں نے باقاعدہ بیعت بھی کر لی اور بیعت قارم پر انکو شاگرد کیا۔ پھر ہمارے گروالوں نے دھوکا دی سے آپ کی والدہ سے اشام بھیڑ پر انکو شے گلوکار آپ کا مکان اپنے نام خلیل کروا لیا۔ چھ ماہ قبل جب تمہاری والدہ کا انتقال ہوا تو ہمارے گروالوں نے انتہائی رازداری سے رات کے وقت لاش روہ لے جا کر عام قبرستان میں دفن کر دی۔“

ماں جان! محمود نے مجھے روہ میں قبرستان کا ایڈریس بتایا اور آپ کی قبر کی نشانی بتائی۔ میں اسی وقت دہاں سے بس میں سوار روہ اور روہ بھنچ گیا اور اب میں آپ کی قبر پر آپ کے قدموں میں کھڑا ہوں۔ میں آپ کی قبر کو غنماں اور غنماں آنکھوں

سے دیکھ رہا ہوں۔

مال جی! میں آپ کا بیٹا سلیم آیا ہوں، جس کے روئے کی آواز پر آپ دوڑ کر آیا
کرتی تھیں۔ آج وہ سلیم آپ کی قبر پر کھڑا رہ رہا ہے۔ مال جی! آج سلیم کو
چپ کرانے کے لئے قبر سے باہر آجائیے۔ درونہ سلیم آپ سے روٹھ جائے گا۔
مال جی! اٹھئے۔ میرے آنسو پوچھئے۔ مجھے سارا دیجئے۔ میں رو رو کر
نہ عال ہو گیا ہوں۔

مال جی! مجھے جائیے۔ آپ کے ساتھ کیا ہتھی؟ آپ کے ساتھ کیا قلم ہوا۔

مال جی! ہم لٹ گئے۔ ہم برواد ہو گئے۔

مال جی! گھم نبوت کے ڈاکوؤں نے آپ سے آپ کا ایمان چھین لیا۔ قاریانی
سانپنوں نے آپ کو ڈس کر آپ کا چراغِ ایمان گل کر دیا۔

ہائے مال جی! آپ کافرہ اور مرتدہ ہو گئیں۔

آپ نے مرزے کو نبی مان لیا۔

ہائے مال جی! آپ سدا جنمی ہو گئیں۔

ہائے اب آپ کو کبھی بھی جنم سے رہائی نہیں ملے گی۔

ہائے آپ کی قبر دنخ کا گز حابن گئی۔

ہائے آپ کی قبر پھوؤں اور سانپوں کا مسکن بن گئی۔

مال جی! اگر میں اپنے سارے آنسو آپ کی قبر پر بہاؤں۔ تو بھی آپ کی

قبر معمذی نہیں ہو سکتی۔

اگر میں خیتم سے کوں کہ وہ اپنے سارے موئی آپ کی قبر پر چڑکا
دے۔ تو بھی آپ کی قبر کی ٹکڑے بھجو کے گی۔

اگر میں ہادلوں سے درخواست کوں کہ وہ اپنے دامن میں سمیٹی ہو گئی ساری
موسلا دھار بارشیں آپ کی قبر پر بر سادیں۔ تو بھی آپ کے مرقد کی تپش میں
فرق نہیں پڑے گا۔

اگر میں دریاؤں سے التناس کوں کہ دنیا کے سارے دریا سمندر میں گردے کی
مجائے آپ کی قبر میں آگریں۔ تو بھی آپ کی آتش قبر پر کوئی اثر نہیں

اکر میں جنات سے الجا کروں کہ وہ بحرِ نجدِ شہلی کی ساری برف لا کر آپ کی قبر پر پھاڑ لگا دیں۔ تو بھی برف کا یہ پھاڑ آپ کی قبر میں ذرہ بحرِ مخدوٰک نہ پیدا کر سکے گا۔

کیونکہ یہ الٰہ اللہ تعالیٰ کی لگائی ہوئی ہے اور اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں بجا سکتا۔ اور کافروں کو اللہ بھی بھی بھی الٰہ سے رہائی نہیں دیں گے۔ ماں جی! میں آپ کا مجرم ہوں۔ اس جہان میں بھی۔ اگلے جہاں میں بھی۔ آپ کے ساتھ ہو کچھ بھی ہوا۔ میری وجہ سے ہوا۔ میری دوستی کی وجہ سے ہوا۔

ماں جی! یہ معاشرہ آپ کا مجرم ہے۔ جو قادریانیوں سے نظر نہیں کرتا۔ جو قادریانیوں کی خیہ سرگرمیوں پر کڑی نظر نہیں رکتا۔ جو قادریانی معلوم ہو جائے پر بھی قادریانی کو مسلم معاشرے سے ہاہر نہیں لگا۔ ماں جی! یہ حکومت آپ کی مجرم ہے۔ جو اس ملک میں مردوں اور زندقیوں کو تہ سچ نہیں کرتی۔

ماں جی! وہ علماء آپ کے مجرم ہیں۔ جو منبر پر بیٹھ کر مسلمانوں کو قادریانیوں کے عقائد و مذاہم سے آگاہ نہیں کرتے۔ جو قادریانیت کے کفر کو نہ نہیں کرتے۔ جو آستین کے ان سانپوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو طشت از ہام نہیں کرتے۔ جو مسلمانوں کے ایمانوں پر پورہ نہیں دیتے۔ ماں جی! کاش کوئی میری ایم۔ بی۔ اے کی ذکری لے لے اور آپ کو جنم کے شعلوں سے بچا لے۔

کاش! کوئی بمحض سے میری تعلیم لے لے اور آپ کو دونخ سے رہائی دلا دے۔ کاش! کوئی نفت میں مجھے اپنا فلام بنالے اور آپ کو بچوؤں اور سانپوں سے بچا لے۔

کاش! کوئی بمحض سے میری بھروسہ جوانی کی زندگی لے لے اور آپ کو عذاب قبر سے بچا لے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔